چرواہے

اوپندر ناتھ اشک

مکتبۂ اردو لاہور

چرواہے

اوپندرناتھ اشک

مکتبہ اردو لاہور

قیمت دو روپے

طبع اوّل

تعداد گیارہ سو

چوہدری نذیر احمد پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر مکتبہ اُردو لاہور سے شائع کی

منٹو کے نام

جو کبھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا

عرضِ ناشر

"چرواہے" اوپندر ناتھ اشک کے ایک ایکٹ کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ہم مصنف کے معاشرتی ڈراموں کا ایک مجموعہ "پاپی" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ پاپی کو شائع کرتے وقت ہم سوچتے تھے کہ جانے افسانوں کا شائق اُردو خواں طبقہ ایک ایکٹ کے ان ڈراموں کو پسند بھی کرے گا یا نہیں؛ لیکن پاپی کی مقبولیت نے نہ صرف اس خیال کی تردید کر دی بلکہ (جیسا کہ ان ڈراموں کو شائع کرتے وقت ہمارا مقصد تھا) سٹیج کے احیاء میں بھی بڑی مدد دی

"چرواہے" مصنف کے کتابی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں نہ صرف مصنف نے آسمانِ خیال کی پہنائیوں میں اور بھی اُونچی پرواز کی ہے بلکہ ڈرامے کی تکنیک کے بھی نئے تجربے پیش کیے ہیں، چلمن، میمونہ، معجزے ایسے ڈرامے ہیں جو یورپ کے بہترین ایک ایکٹ کے ڈراموں کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں۔

نذیر احمد

ترتیب

چرواہے — ایک مطالعہ

مختار صدّیقی

چرواہے سے پہلے اشک کے ڈراموں کا ایک مجموعہ "پاپی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جہاں تک موضوع اور انداز کا تعلق ہے، 'پاپی' کے ڈراموں اور پسِ منظر ڈراموں میں بہت تفاوت ہے۔ اس تفاوت میں 'نقشِ اوّل' اور 'نقشِ ثانی' کے ارتقاء سے بحث نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اگر ہم 'پاپی' کے ڈراموں کی گہری طنزوں اور پسِ منظر ڈراموں کی اشاریت کا تجزیہ کریں تو ہمیں ان میں نفسی تسلسل کا سُراغ مل جائے۔ لیکن چونکہ یہ سطور چرواہے کے ڈراموں تک پہنچنے کا محض ایک ذریعہ ہیں۔ اس لئے ان میں نفسی تجزیہ کا امکان بہت کم ہے۔

"پاپی" کے ڈرامے گہری اور ہلکی طنزوں کی چھایا میں آنکھیں کھولتے ہیں۔

اور جب فنکار ان رسیلے نشتروں کی ضربوں پر ضربیں لگاتا چلا جاتا ہے۔ تو ہمیں اس میٹھے درد میں اس آخری اور مہلک کچوکے کا دھیان نہیں رہتا جو ہمارے مسلمات کی اُونچی تعمیر پیوندِ زمین کر دیتا ہے۔ پھر ایک ڈرامہ پڑھ چکنے کے بعد ہم قدرتاً سُکھ کے سانس یا کسی ممنوع چیز کا انتظار کرتے ہیں کہ اتنے میں دوسرا ڈرامہ ظاہر میں معصوم صورت، لیکن بغل میں نشتر کی بجائے چھری لے کر آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور اُسے ختم کرتے کرتے ہم اپنے چند اور چھپے ناسوروں کے کریدے جانے کا موقع دے چکتے ہیں —

فنکار کی نظر گہری اور باتیں کھری ہوتی ہیں اور بیان اس قدر دارستہ کہ مانے بغیر چارہ نہیں۔ اگر انسانی فطرت کے تقاضے کے مطابق ہم اپنی کمزوریوں سے انکار کرتے ہیں اور اُس کی طنز کو عامیانہ یا سرے ہی سے غلط گردانتے ہیں تو بھی نجات نہیں۔ کیونکہ "پاپی" کے ڈراموں کے اسلوب میں ایک البیلی بے پروائی سی ہے۔ مکالمے ایسے ہیں گویا فن کار پڑھنے اور سننے والوں کے تعصبات اور پسند سے بے نیاز سا ہو کر کرداروں کی نقاشی لفظوں میں مکمل کرتا چلا جاتا ہے۔ اُسے اس بات کی فکر نہیں کہ کوئی پڑھے، سُنے، پسند کرے یا اس پر اور اُس کے پلاٹ پر تہین حرف کہے ظاہر کا یہ الھڑپنا اور بے نیازی اصل میں بڑی گہری اور شعوری کوشش ہے ان ڈراموں کے تیکھے پن کی بے نیازی کچھ ایسی ہی محبوبانہ ہے جیسے قلوپطرہ کا وہ الھڑپن جو اپنے جانثار آمون کے اندیشے کو دیکھ کر پکار اُٹھا تھا "تمہارے اندیشے بیکار ہیں آمون۔"

سینرز میری بات ضرور مانے گا۔
اور اگر وُہ نہ بھی مانے تو مجھے اُس کی پروا کیوں ہو۔"
یہی انداز پاپی کی طنزوں کو کامیاب بناتا ہے اور اُن کے تاثر کو دیر پا کرنے کا ضامن ہے۔

لیکن چرواہے کے ڈراموں کا انداز جداگانہ ہے۔ ان ڈراموں کی خصوصیت ان کا البیلاپن یا ان میں چھپی ہوئی طنزیں نہیں بلکہ ان کی عیاں یا نہاں علامتیں ہیں۔ انہی علامتوں کے پردے میں موضوع کا تانا بانا اُلجھتا سُلجھتا رہتا ہے بہت جگہ یہ علامتیں اسٹیج پر داخلے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس اکثر ڈراموں میں یہ عیاں اور نہاں علامتیں (خواہ وُہ مکالمے سے متعین ہوں اور خواہ ہدایات میں شامل ہوں) اسٹیج پر آتی ضرور ہیں۔ پہلی شق کی بیّن مثال "چرواہے" ہے (جس کے نام پر غالباً مصنّف نے کتاب کا نام رکھا ہے) اس میں مرکزی کردار رتنی ہے جو اپنے ماموں رلئے دھنی رام کے ہاں پڑی ہوئی ہے۔ باقی تمام کردار گوبند، ڈاکو، راجہ وغیرہ رتنی کی افتاد کے مختلف اور ننھے ننھے پلٹے نظر آتے ہیں۔ کھیل اسی ایک کردار کے گرد گھومتا ہے۔ رتنی بقول اپنے "روز روز کی بے عزتی، طعنے مہنے، روح اور جسم کی قیدا غلامی اور بے بسی برداشت کئے جارہی ہے۔ ڈاکہ کی واردات اور گوبند کا جیوٹ اس کی آزاد، لیکن خارجی طور پر محبوس روح پر تازیانہ بن جاتا ہے اور پھر اسٹیج کے عقب میں کبھی کبھی اُٹھنے والا "چرواہوں" کا برکھا اور بادل جیسا آزاد گیت ......

"مہارا جنگل کا سب ساج سدا رہتی ہے دُوب ہری
سدا رہتی ہے دُوب ہری"

اس کی اس خفتہ روح کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو چرواہوں کا گانا (سٹیج کے باہر کی علامت) اور دوسری طرف کانت کی کھوکھلی زندگی (سٹیج کے اندر کی علامت) اسے فیصلہ کُن بات پر اُبھارتے ہیں یہیں کانت کے مقابلے میں رتنی کا کردار اور بھی اُبھرتا ہے اور اُس کی رُوح پکار اُٹھتی ہے۔

"اوہ کہیں میں انہی چرواہوں کی طرح آزاد ہو کر —— روز روز
کے طعنوں، مہنوں اور کوسنوں اور لانچھنوں سے آزاد ہو کر، اس
روز روز کی غلامی اور بے بسی سے مُکتی پا کر اُن چرواہوں کی طرح
گاتی ناچتی گھوم سکتی"

اور وُہ اسی آزاد رُوح کی وُسعت میں اپنی برسوں سے دبی ہوئی روح کو بے سہارے چھوڑ دیتی ہے جس کا ایک رُوپ تو چرواہوں کے وُہ گانے ہیں جو کھیل میں بڑے نازک موں پر اسٹیج کے عقب سے اُبھر کر تمام سٹیج پر چھا جاتے ہیں اور دوسرا اور جیتا جاگتا روپ گوبند ہے جو گاؤں کی وسیع و عریض چراگاہوں میں اپنے ڈھور ڈنگر چراتا ہے اور وقت پڑنے پہ ڈاکوؤں کا سامنا کرنے سے بھی نہیں گھبراتا۔

رتنی چلی جاتی ہے اور کانت زیادہ سے زیادہ دو ایک تلخ فقرے کس کر رہ جاتا ہے۔ یہ فقرے ایک جہاندیدہ، تجربہ کار، دماغ کی اُپج تو ہیں لیکن

سر شور جوانی کے لئے وُہ قطعاً بے اثر ہیں۔ اس طرح چروا ہے میں اگر رتنی کا کردار سر شور، نادان، حقائق اور نتائج سے بے پرواجوانی کی علامت (SYMBOL) ہے تو کانت اس پختہ کار اور معمّر جوانی کی جس نے زندگی کی تلخیوں کا مزا چکھ لیا ہے اور اس سے سمجھوتہ بھی کر لیا ہے۔ یہ دونوں واضح علامتیں ہیں۔ اسٹیج پر ہم انہیں اپنے سامنے دیکھتے ہیں۔ لیکن فیصلہ کُن علامت —— چرواہے —— کہیں سٹیج پر نہیں آتے۔ صرف اُن کا رسِ بھرا گیت عقب سے اُبھر کر تھوڑی دیر تک مکالموں میں تھرتھراتا رہتا ہے پھر گُم ہو جاتا ہے —— بالکل اسی طرح جیسے ہر قید و بند سے آزاد زندگی کے سپنے کی تعبیر اس زندگی میں نہیں ملتی۔ کبھی کبھی یہ سپنا آنکھوں کے سامنے اپنا سنہری دام پھیلاتا ہے اور پھر چرواہوں کے گیت کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے —— حد یہ ہے کہ گوبند بھی، جس کی ذات میں چرواہوں کی آزادی اور بہادری مجسّم ہو گئی ہے، تمام ترکھیل میں کہیں اسٹیج پر نہیں آتا۔

اس کے برعکس 'چلمن'، 'معجزے'، 'کھڑکی' اور 'سُوکھی ڈالی' میں علامتوں کی باڑ دوہری ہے جو جیتے جاگتے کرداروں اور اسٹیج پر بے جان چیزوں میں ایک دوسرے کا بدل بنتی ہے —— مثال کے طور پر 'چلمن' کو لیجئے۔ اس میں سدا جلتے رہنے والے دکھ دبیک کی ہلکی ہلکی لیکن مستقل جلن ہے اور تمام کھیل میں ہری اور کرن کے کردار اس قوّت سے اُبھارے گئے ہیں کہ گداز بھرے مکالموں میں یہ دونوں میاں بیوی جیتے جاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلی نظر میں بیمار کرن کا یوں جسم پا نکلنا بڑی خوفناک بات معلوم ہوتی ہے۔ ایک

مریضہ جسے ریڑھ کی ہڈی کا ناسور ہے بیٹھے لیٹے ہڈیوں کا ایک ڈھانچ رہ گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے اس احتیاط کے خیال سے کہ اگر وہ ہاتھ پاؤں ہلائیگی تو ناسور کے اندمال میں رخنہ آئے گا۔ اس کے پاؤں میں انہیں باندھنے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ رسیوں سے جکڑی بے حس و حرکت بیمار کرن پڑی پڑی لاتعداد حسرتوں کے جال بُنے جا رہی ہے ـــــ ہری کو لیجئے تو اپنی بیوی کی تیمارداری میں اُس کا یہ انہماک ہی اُسے غیر معمولی کردار بناتا ہے۔ لیکن منوہر کی رقابت اُس کے اس انہماک کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیتی ہے اور ہم پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ہری اپنی بیوی کی بیماری سے اپنی پُر سوز نظموں کے لئے غذا حاصل کرتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اگر یہ بات مان لی جائے (جیسا کہ خود کھیل میں اسکے سُراغ موجود ہیں) تو ہری کی شخصیت بڑی پُراسرار بن جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے تو ہری کی ہستی ایک غیر معتدل اذیت پرستی اور مجرمانہ مدرکات کا مرکب دکھائی دیتی ہے ـــــ کیونکہ اُس نے اپنی نظموں کی غذا کے لئے بیماری، تیمارداری اور شاعری کا تانا بانا بڑی کاریگری سے اپنے گرد بُن رکھا ہے۔ شنتی غریب اس مکڑی کے ریشمیں جالے میں پھنسی ہوئی ایک نادان مکھی ہے جسے ہری کی عنکبوتی فطرت ملنے سے انکار کرتی ہے اور شنتی ہی وہ گہرا نیلا ٹاٹ، وہ رنگ برنگی تیلیوں کی چلمن ہے جو کرن کی زندگی اور زندگی کی روشنی کے درمیان حائل ہے یہ علامت آخر میں کرن کے ایک فقرے سے بالکل ظاہر ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں چلمن سٹیج پر موجود ہے۔ وہاں ساتھ ہی سٹیج کے عقب میں اس علامت کا بدل شنتی کے بھی قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کھیل کے

دوران میں چلمن کی بے جان علامت ہر وقت آپ کے سامنے موجود رہتی ہے لیکن اس کا جیتا جاگتا بدل ششی کبھی سٹیج پر نہیں آتی۔

ششی سٹیج پر نہیں آتی ——— تاہم اُس کا وجود قائم ہے۔ منوہر، ماں، خود کرن کے فقرے اس کے کردار کو جسم دیتے ہیں۔ چلمن کی رنگت اس کی فطرت کا آئینہ تیار کرتی ہے ——— جیسے وُہ بھی گہرے نیلے ٹاٹ سی خود دار اور کم دل ہو گی۔ اس میں صحرا کی بیٹیوں کی سی وُہ شعلہ مزاجی ہے کہ اس تعقل کے زمانے میں بھی ہری کی پُرسوز نظمیں اس کے دل میں محبّت کی چنگاری کو بھڑکا دیتی ہے اور وُہ بنارس سے چلی آتی ہے ——— لیکن اس کا یوں بھڑک اُٹھنا بھی گہرے نیلے ٹاٹ کی رعایت سے کوئی طلسماتی یا کیمیاوی آگ معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں روزمرہ کی آگ سے لال لال صحت مند شعلے نہیں یہیں سے ہری اور کرن کے مرکزی کردار ماند پڑنے لگتے ہیں۔ بلکہ ششی کا ٹوٹے تارے ایسا کردار میرے سامنے مجسّم آکھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت میری نظر ہری اور کرن کی شوخ اور واضح تصویروں پر نہیں جمتی بلکہ پس منظر کی دھندلاہٹوں سے کہیں تیکھے نقش، اور غزالیں آنکھوں والی، ششی کے موہوم خدوخال اُبھرتے، مدھم ہوتے مجھے جذب کر لیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہری اور کرن کی واضح تصویر کشی پر اوپندر ناتھ کے مؤلف نے اتنی محنت نہیں کی جتنی ششی کی اُس دھندلی کایا کو ایک رُوپ دینے میں ——— کیونکہ اُس کی دھندلاہٹوں میں وضاحت اور وضاحت میں ابہام ضروری تھا۔

——— ترغیب کی یہ تصویر کشی مشکل بات تھی۔

یہاں مجھے جے۔ سی۔ ڈالمین کی مشہور تصویر "سینٹ انطونی کی آزمائش" (TEMPTATION-OF-ST:ANTHONY.) کا خیال آتا ہے۔ اس بیش بہا تصویر کے متعلق ٹالسٹائی کا خیال تھا کہ اس تصویر کا آرٹ اس قدر سوقیانہ اور خام ہے کہ مصور کی توجہ سینٹ انطونی پر اتنی مرکوز نہیں جتنی اُس کے پس منظر میں نیم عریاں عورت کے دھندلے سے خاکے پر۔ ٹالسٹائی کا نقطۂ نظر اور اس سلسلے میں کسی طرح کی بحث و تمحیص موضوع سے دُور ہے۔ یہاں اس کا ذکر اس سلسلے میں آیا کہ اسکی تصویر کشی کی نیم عریاں، ترغیب مجسم عورت مجھے حلیمن کی شششی کا بدل معلوم ہوتی ہے۔
پہلی نظر میں سینٹ انطونی کی پاکیزہ شکل، اس کے سر کے گرد نور کا ہالا، ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے —— حلیمن میں اسکی مثال ہری اور کرن کے واضح کردار ہیں —— کرن لب گور ہونے کے باوجود زندگی کی بے پناہ تڑپ اپنے دل میں رکھتی ہے —— لیکن جب ہم انطونی کی تصویر سے نگاہ ہٹا کر باقی تصویر کی طرف نظر دوڑاتے ہیں۔ تو پس منظر کے دُھندلکوں میں نیم عُریاں، دمکتا ہوا پیکر ہمیں اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔ اصل شے وہی نظر آتی ہے کیونکہ وہی تو آزمائش ہے۔ وہی تو ترغیب ہے جس سے تصویر کا مفہوم وابستہ ہے۔ ورنہ اس کے بغیر بھی تصویر مکمل تھی اور اس کا عنوان مثلاً صرف "سینٹ انطونی" ہو سکتا تھا۔ میرے نزدیک اس لئے ڈالمین نے اس دُھندلے خاکے پر اتنی محنت کی ہے اور سینٹ انطونی پر کم۔ یہی حال "حلیمن" میں شششی کا ہے اور

شتی ہی کی وجہ سے کھیل کا نام حلیمن ہے۔ ورنہ اگر شتی کے کردار اور حلیمن کی علامت کو زیادہ دھندلا کر دیا جائے تو ڈالمیین کی تصویر کی طرح اس کھیل کا نام بھی "ہری کی مصیبت" یا "زندگی کی تڑپ" وغیرہ ہو سکتا تھا۔

"میمونہ" بڑی درد بھری جھلکی ہے۔ یہی بات کہ تمام کا تمام کھیل قدروں اور اندازوں کی غلطی پر مبنی ہے، موضوع کو کافی المناک بنا دیتا ہے۔ پھر اس کھیل میں ایک معصوم بچی کی بھٹکی ہوئی بے آسرا روح کا تخیل اُسے اور بھی غم انگیز کر دیتا ہے۔ میمونہ (بچی) آمنہ (ماں) کے پہلے خاوند ساجد مرحوم کی جیتی جاگتی نشانی ہے۔ اس لئے آمنہ کو اُس کی صورت ہی سے چڑ ہو گئی ہے۔ کیونکہ ساجد بھی آمنہ کی نفرت کا مرکز بن چکے تھے۔ میمونہ ایک سیدھی سادی بچی ہے جس میں ماں کے اس بُرے سلوک نے کسی قسم کی جذباتی اُلجھنیں نہیں پیدا کیں۔ وُہ صرف محبّت کی بھوکی ہے۔ آمنہ کا موجودہ خاوند ارشد جس سے آمنہ نے ساجد کی وفات کے بعد شادی کی ہے۔ ایک لحاظ سے میمونہ ہی کی ایک بالغ علامت (SYMBOL) ہے کیونکہ آمنہ اب اُس کی مفلسی اور مفلسی سے پیدا شدہ لااُبالی پن سے اُکتا کر پھر اپنے دیور ماجد کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔ تمام کھیل میں آمنہ کی قدریں اور انداز بے خوب ہیں —— اپنے پہلے خاوند ساجد کی زندگی میں وُہ ساجد کی بیٹی میمونہ کو ارشد کی بیٹی —— اپنے چچا کی بیٹی کہا کرتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مجرم ضمیر ساجد سے جذباتی یا شاید جسمانی بے وفائی کو شعور میں کچھ اس طرح کے دلائل سے حق بجانب ثابت کرتا تھا۔

"ساجد فضول آدمی ہے ——— لیکن میں بھی کیا کرتی۔ ارشد تو مفلس تھے قلاش اور ساجد امیر۔ اس لئے اسے قبول کرنا ہی پڑا۔

لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ ساجد کی شریکِ بستر ہو کر میں اس کی ایک بیٹی کی ماں بھی کہلاؤں گی۔

توبہ۔ یہ لڑکی ...... ساجد کی بیٹی ہے ...... الٰہی توبہ ......

——— بچّی اچھی ہے اور میری بھی تو ہے ...... لیکن ساجد ..... ساجد اس کا باپ ہے۔ نہیں نہیں یہ تصور ہی ناقابل برداشت ہے۔

ارشد اب بھی میرے خیالوں کے دیوتا ہیں۔

اف ...... لیکن میمونہ ...... یہ ساجد کی بیٹی کاش ارشد کی کہلاتی۔

اچھا ——— تو کیا ہوا ——— ممّو ارشد کی بیٹی ہے۔ میں اس میں اس کا عکس دیکھوں گی ——— کتنی ملتی ہے یہ ارشد سے۔

کیوں ممّو، تُو ارشد کی بیٹی ہے نا ——— ارشد چچا کی بیٹی ———

اُس کی خوش قسمتی سے امیر ساجد مر جاتے ہیں اور اب وُہ ارشد سے شادی کر لیتی ہے۔ اب اُس کے ہاں ایک بیٹا ہوتا ہے ——— فریدہ آمنہ، ارشد سے شادی تو کر لیتی ہے۔ لیکن امارت اور اُس کی نفاستیں اُس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہیں۔ ارشد کی غیر مہذب غربت اُس کی نفاستِ طبع کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ اور وُہ اسے ذلیل سمجھ کر اپنے دیوتا ساجد کو مرکزِ خیال بنا لیتی ہے اور فریدہ اس کے اس نئے مرکزِ خیال ساجد کا ننھا منا اشاریہ بن جاتا ہے نتیجہ یہ کہ میمونہ غریب کی شامت آجاتی ہے اور اس کے ساتھ اس لئے بدخوئی

ہوتی ہے کہ فرید امتیازی محبت کے بھنورے میں پل سکے اور ارشد بھی ——— غریب میمونہ کا بالغ پرتو ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھیل میں آمنہ تمام کرداروں پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے تجزیہ میں عورت کی فطرت کے وہی ترکیبی جزو ملتے ہیں جو شاید افلاطون نے متعین کئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ انتخاب میں ہمیشہ غلطی کرتی ہے اور اندازوں میں ہمیشہ ٹھوکر کھاتی ہے اس لحاظ سے یہ کھیل آمنہ کے اندازوں کی نفسی ٹھوکروں کا تانا بانا ہے یہی وہ چیز ہے جو اس کے کردار سے ہمیں نفرت نہیں دلاتی بلکہ اس نکتہ پر پہنچ کر ہمیں اس سے ہمدردی شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا قصور قدروں اور اندازوں کے تعین میں مغالطہ اور پھر مغالطہ ہے ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہم میں سے اکثر آدمی ذرا بدلے ہوئے رنگ میں ایسی ہی غلطیاں نہیں کرتے۔

مقناطیس کے متعلق میں کچھ اس لئے نہیں کہتا کہ زیر نظر تمام ڈراموں میں سے سب سے زیادہ مجھے یہ پسند آیا۔ اس لئے ڈرتا ہوں کہ جہاں اور ڈراموں پر غور کرنے سے ان تک پہنچنے کی جو راہیں میری سمجھ میں آئیں۔ وہ میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ اب اگر اس کھیل کے متعلق کچھ کہوں تو شاید میری پسند کا تعصب آپ کی آنکھوں کی پٹی نہ بن جائے ——— ایک کرم فرما کہتے ہیں کہ اس پسند کی تہ میں میری اپنی دبی ہوئی آرزو پنہاں ہے ——— وہ یہ کہ ڈرامے کا مرکزی کردار گوتم اپنے گداز سے لبریز نغموں کے مقناطیس سے دو مختلف ذروں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ لیکن میری ذات گوتم سے اپنی وجودی وحدت (IDENTIFICATION) اس لئے مکمل نہیں کر سکتی کہ میرے

نغموں کا مقناطیس ابھی تک لوہ چون کے کسی ایک ذرے کو بھی اپنی طرف نہیں کھینچ سکا ــــــ شاید ان کرمفرما کی یہ بات سچ ہو۔

البتہ کرداروں میں دو باتیں واضح ہیں۔ شاعر گوتم کی فطرت ہزیمت خوردہ، سپنے دیکھنے والی ہے۔ اس ہزیمت خوردگی اور اس کے بیان سے وہ دوسروں کی ہمدردی بلکہ محبت تک حاصل کر لیتا ہے۔ یہی اس کی فتح ہے ــــــ سرتا جو بینہ اور جھکڑ میں اپنے رومانی تخیّل (ROMANTIC-IMAGINATION) کے باعث اس کی مزعومہ پریشانی سے پریشان ہو کر اسے سہارا دینے آتی ہے۔ خود ایک سرشور طوفانی ندی ہے جس کا بہاؤ عناصر کی یہ بے اعتدالی روکتی نہیں بلکہ زیادہ کرتی ہے۔ اس لئے آندھی اور چھاجوں برستا بینہ اس کے راستے میں کسی طرح کی رکاوٹ پیش نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے عزم کو اور بھی مضبوط کرتے ہیں اور اس کا رومانی تخیل اس آندھی اور بارش میں تھکتا یا بھیگتا نہیں بلکہ پر کھول کر اور بھی تیزی سے اڑتا ہے۔ اس میں ایک لطیف بات یہ ہے کہ اس کا نام ہی اس کی فطرت کا آئینہ ہے ــــــ سرتا یعنی ندی۔

اب "معجزے" کو لیجئے۔ اس کی ارتقائی کڑی پاپی کے بعض ڈراموں مثلاً "دیوتاؤں کے سائے تلے" یا "حقوق کا محافظ" سے ملتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ جہاں تک میں پیش نظر ڈراموں اور پاپی کے ڈراموں میں تفاوت یا مناسبت کا کھوج لگا سکا ہوں "معجزے" ہی ایک ایسا کھیل ہے جو ان دونوں مجموعوں کے درمیان سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ــــــ اس میں اگر ایک طرف پاپی کے بعض ڈراموں کی سی مزاح میں لپٹی ہوئی تلخ طنز ہے تو دوسری جانب جرواہے کے ڈراموں کی سی

اشارتی خصوصیت بھی ہے۔

مردہ مچھلی برباد زندگی اور کھوئی ہوئی مردانگی کی علامت ہے۔ ترکی ٹوپی والے نے مُردہ مچھلی حاضرین کے سامنے پیش کر کے جو ماحول پیدا کر دیا ہے۔ وُہ دوائی بیچنے والے مجمع گیر (QUACK) کے لئے بالکل مناسب ہے۔ کیونکہ وُہ بھی زندگی کے جوہر کا ٹیکہ چلتی پھرتی زندہ لاشوں کی رگوں میں اس طرح کر دے گا کہ ان میں روٹھی ہوئی زندگی کا لوٹ آنا معجزے سے کم نہ ہوگا ——— اسی طرح جیسے خداوند یسوع مسیح نے ایک مردہ دوشیزہ کو ایک جنبش لب سے زندہ کر دیا تھا اور یہ ان کا معجزہ تھا ——— چنانچہ "آئے یسوع مسیح اور مُردہ مچھلی کو زندہ کرے" ——— کی للکار لوگوں کے دلوں کو "معجزہ" اور مذہب کے متعلق مشتعل کر چکی ہے کہ اتنے میں حکیم جی وارد ہوتے ہیں اور اس معجزے کے بیان اور بحث سے بات شروع کر کے لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ اُلو بھی بنا چکتے ہیں۔ یہاں طنز بھرپور تیکھی ہے اور یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ مذہب میں لوگوں کی دلچسپی اوپری سی ہے۔ مذہب کے گہرے مسائل کے متعلق بحث کرتے سُنتے لوگوں کو مذہب کی بجائے دوائیوں کی معجز نما تاثیر لبھانے لگتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اصل معجزہ وُہ مقدس روائت نہیں کہ خداوند یسوع نے ایک مردہ لڑکی کو زندگی بخشی بلکہ یہ ہے کہ کس طرح دیکھتے دیکھتے ایک بازاری حکیم لوگوں کی جیب سے ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی نکال کر لے جاتا ہے۔

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ترکی ٹوپی والے کی تمام مذہبی بحث اور اشتعال حکیم جی کے ساتھ پہلے کی گٹھی ہوئی بات تھی تو لوگوں کا اس طرح دیکھتے دیکھتے دھوکا کھا جانا اور بھی حیرت کی بات ہے۔ چنانچہ اس طرح "اشتہاری دوائی" اس اعتقاد کی علامت

ہے جو لوگوں کو ان اوتاروں، پیغمبروں اور سادھو سنتوں کی ذات میں ہے۔ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ جو بھی فوق العادت بات کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں اور اس طرح معجزے میں علامتیت کی باڑ تنہری ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اشارے مبہم ہیں۔ لیکن ذرا غور کرنے پر بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس خشک ڈالی میں اشارہ بہت واضح ہے۔ بڑ کا درخت سٹیج پر بھی آتا ہے اور خود دادا جو اس علامت کا زندہ بدل ہیں وہیں موجود ہیں۔ مستزاد اس پر کہ دادا اس علامت کی اہمیت تمام کھیل میں بار بار بڑی وضاحت سے بتاتے ہیں ——— ایک عظیم الشان برگد کا درخت موت کے لکڑہارے کے کلہاڑے کے نیچے کٹ کر گرنا پسند کرے گا۔ لیکن وہ ایک ذرا سی ڈالی ایک ننھی منی کونپل کا ٹوٹنا گوارا نہیں کر سکتا ——— یہ الگ بات ہے کہ وہ کونپل یا ڈالی اس کے ساتھ لگی لگی سوکھ جائے اور یہیں اشک نے اپنی طنز کا نشتر پورے زور سے ہمارے مروجہ اجتماعی سماجی نظام پر لگایا ہے۔

یہاں تک تو تھیں ڈراموں کی اشارتی وضاحتیں، جن کا بیان میں نے ضروری سمجھا ہے۔ اب اگر ڈراموں کے بنیادی جذبوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں جہاں بنیادی اشتراک ہے۔ وہیں ایک قسم کی رنگارنگی بھی موجود ہے ——— 'چرواہے' 'چلمن' 'مقفل بلبس' میں ایک کردار خود شاعر ہے لیکن ان تینوں کرداروں کی شاعرانہ اُفتاد الگ الگ ہے۔ 'چرواہے' کا شاعر کانت خیالات کی دُنیا کا باسی ہے، یہ ٹھیک ہے کہ اس کی آنکھیں کھلی ہیں۔ وہ دُنیا کی تلخ حقیقتوں کو جان گیا ہے۔ لیکن وہ محض خیالات کے ڈھور ڈنگر چراتا ہے۔ اس میں عمل کی قوت یکسر مفقود ہے اور چونکہ ڈرامے کا

جذباتی محرکِ عمل" اور "آزادنظری" ہے۔ اس لئے کانت کا کردار ہمیں ایک بے عمل عالم کی طرح مفلوج نظر آتا ہے۔ لیکن 'چلمن' اور 'مقناطیس' کا شاعر کردار بنیادی کردار ہے۔ جس کے بُنے ہوئے جالے اور ان جالوں میں پھنستے ہوئے کم مایہ کردار اپنے کمزور ماحول کی جھلکیوں سے تمام ڈرامے کی دیواریں استوار کرتے جاتے ہیں۔ 'مقناطیس' کا شاعر اپنی خیالی ہزیمت خوردگی اور مظلومیت کو اس لئے گیتوں میں بُنتا رہتا ہے کہ وہ اس حربے سے دوسروں کو ہزیمت دے سکے اور ان کو اپنے ستم کا نشانہ بنا سکے۔ ذرا بدلے ہوئے رنگ میں یہی حال 'چلمن' کے شاعر ہری کا ہے جو بقول منوہر اپنی بیوی کی تیمار داری میں غیر معمولی انہماک اس لئے دکھاتا ہے کہ وہ اپنی درد بھری نظموں سے دوسروں کو تڑپا تڑپا کر اپنے قدموں میں لا گرائے ——— منوہر دراصل اس کے لاشعور میں چھپے ہوئے جذبے اس کے سامنے بے نقاب کر دیتا ہے۔ یہ اذیت پرستی بڑی جابرانہ اور کرشمہ ساز ہے۔

یہ تینوں شاعر کردار ظاہر میں ایک دوسرے سے متفاوت نظر آتے ہیں لیکن اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اِن تینوں کرداروں کے مختلف مزاج ایک ہی بنیادی افتاد کے تین پلٹے نظر آتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپندر ناتھ کی اپنی ذات کی ہم آہنگی اس بنیادی اُفتاد سے کس حد تک ہے۔ کیونکہ ان تینوں مختلف رنگوں میں انہوں نے اپنی شخصیت کے چربے چھوڑے ہیں۔ ورنہ ایک، دو چھوڑ تین تین ڈراموں میں کوئی شاعر کردار رکھنے یا ایسا پلاٹ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ جس میں ڈرامے کا تانا بانا شاعر کے پھیلائے ہوئے سنہری جال کی چھایا ہو۔ اور پھر دوسرے ڈراموں میں بھی شاعر نہ سہی لیکن شاعر کردار ضرور موجود ہیں۔

مثلاً معجزے ' میں گھنٹی والے کی چرب زبانی شاعرانہ ہے۔ سوکھی ڈالی میں دادا اور اک کی ان منزلوں پر ہیں۔ جب شاعری اور اس کا علم شاعرانہ الہام سے جا رشتہ جوڑتا ہے ' ——— اور تو اور میمونہ کا ارشد بھی شاعرانہ طبیعت کا گنہگار ہے اور پھر چرواہے میں کائنات کے علاوہ خود رتنی کا کردار بھی شاعرانہ روح کا مالک ہے۔ جس کے عملی پہلو پر گوبند کی آدرش مردانگی حالہ بناتی ہے اور اسکی تخیلاتی کائنات میں ہر بانہ کے چرواہوں کا گیت ———

مہارا جنگل کا سب ساج سدا رہتی ہے دوب ہری

سدا رہتی ہے دوب ہری

اور برکھا اور بادل ایسی آزادی اور مادر فطرت سے بے تکلّف ربط ضبط ناچتے گنگناتے رہتے ہیں۔ رتنی میں تصوراتی تحریک اور آدرش کے لئے یہ پکار صحیح شاعرانہ فطرت کے تار و پود ہیں ———

"——— جی چاہتا ہے سب بندھن توڑ دوں۔ سب کچھ دیکر آزادی لے لوں، گاتی پھروں ڈھور ڈنگر چراتی پھروں . . . . ."

". . . . . لیکن میں ان کا گیت سنتی ہوں۔ وہ جیسے اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے ——— زندگی بخش رس بھرا . . . "

مجھے رتنی کی روح اس اجنبی کی روح کا پرتو معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر باڈلیر نے اپنی اس نثری نظم میں کیا ہے ———

"پُراسرار اجنبی تم یہ تو بتاؤ، تم سب سے زیادہ کسے چاہتے ہو . . . . . اپنے پتا کو اپنی ماں کو؟ اپنی بہن کو اور یا ——— اپنے بھائی کو؟"

"میرے تو ماں باپ بھائی بہن ہیں ہی نہیں"۔

"اچھا تو پھر اپنے دوستوں کو؟"

"تم نے وُہ لفظ استعمال کیا ہے جو میرے لئے آج تک معمّہ رہا ہے"۔

"تو تمہیں اپنی جنم بھُومی بہت پیاری ہے اجنبی؟"

"مَیں آج تک یہ نہیں جان سکا کہ میری جنم بھُومی دُنیا کے کِس خطے میں ہے"۔

"تو تم حسُن پر مِٹے ہو؟"

"کاش میں اس لافانی سچائی کو پیار کر سکتا"۔

"اچھا تو تم دولت کو۔۔۔۔"

"مجھے دولت سے اسی طرح نفرت ہے جیسے تمہیں خدا سے"۔

"تو پھر پُراسرار اجنبی تم ہی بتاؤ تمہیں کِس شے سے پیار ہے؟"

"مجھے۔۔۔۔ مجھے بادلوں سے محبّت ہے ــــ وُہ گذرتے ہوُئے سفید، مٹیالے، کالے ــــ پُراسرار شاندار بادل"۔

جہاں تک اِس سوال کا تعلق ہے کہ ان ڈراموں کے کرداروں میں اشک نے اپنا پرتو کِس طرح اور کِس کِس رنگ میں چھوڑا ہے۔ یہ ایک علیحدہ مطالعہ اور علیحدہ مضمون کا محتاج ہے جس کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں اُن کی پیش نظر تخلیق ہی نہیں بلکہ دوسری فنی تحقیقات کے گہرے مطالعہ کے ساتھ اُن کی زندگی کے بدلتے ہوئے رنگوں کی مطابقت بھی ڈھونڈنا پڑے گی۔ دیباچے کے یہ مختصر اوراق ایسی دقیق بحث کے جو یہاں جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہے حامل نہیں ہو سکتے ــــ

ڈرامے آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو پڑھنے اور ان پر غور کرنے کے بعد جو باتیں میں نے اخذ کیں وہ میں نے آپکے سامنے پیش کر دیں۔ علامتوں اور اشاروں کی دُھری اور اکھری باڑیں یا کرداروں کے تہرے رنگ اور اکہری لہریں میرے تجسس نے ان میں ڈھونڈ نکالیں۔ میرے تجسس کا یہ فرض تھا کہ اُن کی شہادت دے ؛

پل بنگش　　　　　　مختار صدیقی

چرواہے

افراد

رائے دھنی رام	رتنی	کانت
کشنی	راجہ	جسودا
برنداابن	مامی	بلّو
	لوآ	

(پردہ اُٹھنے سے پہلے عقب میں دور سے چرواہوں کے گانے کی گونجتی ہوئی سی آواز آتی ہے)

ہے جی ہاں آں، ہاں آں، ہاں آں، ہاں ——
ہمارا جنگل کا سب ساج سدا رہتی ہے دوب ہری
سدا رہتی ہے دوب ہری ——
سدا رہتی ہے دوب ہری ——

(پردہ آہستہ آہستہ اُٹھتا ہے۔ رتنی اپنے کمرے کی کھڑکی میں چپ چاپ کھڑی گانا سُن رہی ہے۔ گانے کی آواز گونجتی اور دُور ہوتی جاتی ہے)

کسے کے رَے دھن کا بھرے ہے خزانہ
کوئی رے کرتا کام بیگانہ
ہمارا من اپنے کا راج رہے آسا کی بیل بھری

رتنی (کمرے میں بیچینی سے گھومتے ہوئے اپنے آپ) چرواہے گا رہے ہیں —
اپنا امر آزاد رس بھرا گیت ——— جی چاہتا ہے سب بندھن توڑ دوں
روز روز کی غلامی سے نجات حاصل کر لوں۔ سب کچھ دے کر آزادی حاصل
کر لوں۔ گاتی پھروں۔ ڈھور ڈنگر چراتی پھروں۔ دونوں باہیں پھیلا کر زندگی
کو ۔ ۔ ۔ ۔

(کانت داخل ہوتا ہے)

کانت ۔ کس سے باتیں کر رہی ہو رتن ؟
رتنی ۔ چرواہے گا رہے ہیں۔
کانت ۔ کہاں گا رہے ہیں ؟
رتنی ۔ یہ سنو ۔ ۔ ۔ یہ سنو ۔ ۔ ۔
کانت ۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔
رتنی ۔ شاید وہ دور چلے گئے ہیں۔ لیکن میں اُن کا گیت سنتی ہوں۔ وہ میرے کانوں
میں اب بھی گونج رہا ہے ——— زندگی بخش، رس بھرا ۔ ۔ ۔
کانت ۔ رس بھرے گیت زندگی کی تلخیوں سے نکلتے ہیں۔
رتنی ۔ (گویا ابھی گیت سن رہی ہے) آزاد روح کا آزاد گیت ۔ ۔ ۔ ۔
کانت ۔ آزاد کہاں، روح تو حیات کی قید میں بند ہے۔ موت اس قید کا دروازہ ہے

(رتنی چپ رہتی ہے)

کانت ۔ اور چرواہے کیا اس قید سے آزاد ہیں (زیرِ لب ہنستا ہے) ہر ایک شخص کو
دوسرے کی زندگی اچھی لگتی ہے۔ چرواہے سمجھتے ہونگے ——— تم رانی ہو۔

رتنی - رانی . . . . (طنز سے ہنستی ہے)

کانت - اور تم سمجھتی ہو، چرواہے اپنے من کے راجہ ہیں، جہاں چاہتے ہیں گھومتے ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، لیکن بھوک، پیاس، غریبی . . . . .

رتنی - اس غلامی سے وہ غریبی اچھی ہے - روز روز کی بے عزتی، طعنے مہنے، روح اور جسم کی قید —— روح اور جسم آزاد ہوں تو بھوک اور پیاس سہی جا سکتی ہے۔

کانت - اس کی حقیقت کسی بھوکے سے پوچھو۔

رتنی - تم نے اپنی روح کو غلام بنا رکھا ہے - اپنے چچا کے دھن پر موج اڑاتے ہوئے تم ذلت سہہ لیتے ہو۔ . . . .

کانت - رتنی . . . .

رتنی - تم نے خود اپنی روح کو غلام بنا رکھا ہے اور اس غلامی کے لئے دلیلیں ڈھونڈ لی ہیں اور پھر تم شاعر کہلاتے ہو۔ کاش تم ایک شاعر نہ ہوتے۔ محض ایک چرواہے ہوتے۔

کانت (کھو کھلا قہقہہ لگاتا ہے اور اُٹھ کر کمرے میں ٹہلتا ہے) چرواہا (ہنستا ہے) مَیں چرواہا ہی تو ہوں۔ خیالات کے ڈھور ڈنگر چراتا ہوں۔ بار ہا وہ بکھر جاتے ہیں۔ کتنی انجان کھنبوں میں چلے جاتے ہیں۔ مَیں اُنہیں پھر کھوج کھوج کر اکٹھے کر لاتا ہوں۔

رتنی (جا کر کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی ہے اور باہر خلا میں دیکھتی ہے پھر مڑ کر نفرت کے دبے ہوئے جذبے کے ساتھ) تو تم خیالات کے ڈنگر ہی چرایا کرو گے۔ زندگی کے ڈھور ہانکنا تمہاری قسمت میں نہیں۔ خیال . . . خیال . . . . خیال . . .

اور بس ــــــ گوبند کو دیکھا تھا . . . . .

(بلّو کندھے پر جز دان لٹکائے جلدی جلدی داخل ہوتا ہے)

بلّو۔ رتنی، گوبند آگیا۔

رتنی۔ کہاں ہے ؟

بلّو۔ تھانے میں ہے۔ شاید ڈاکو پکڑے گئے ہیں، ہتھکڑیاں پہنے کھڑے تھے۔ میں نے سکول سے آتے ہوئے دیکھا اُنہیں۔

(پھر جلدی جلدی چلا جاتا ہے)

رتنی (اپنی بات کو جاری رکھتے ہُوئے) وُہ کبھی بھُوکا پیاسا ہو سکتا ہے۔ تن ڈھانپنے کے لئے اُس کے پاس کپڑوں کی کمی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے پاس آزاد روح ہے ــــــ اس آزاد روح کا کرشمہ دیکھا . . . . .

کانت۔ کرشمہ ؟

رتنی۔ یہ کرشمہ نہیں تو اور کیا تھا۔ ڈاکو ہمارے مکان پر چڑھے فائر کر رہے تھے اور سارے گاؤں والے اپنے اپنے مکانوں کے کواڑ لگائے لحافوں میں دبک گئے تھے . . . .

کانت۔ مَیں نے فائروں کی آواز نہیں سُنی . . . . .

رتنی۔ تم نے اپنے روشندان بھی بند کر دیئے ہوں گے۔

(کشنی بستہ لئے داخل ہوتی ہے اور چُپ چاپ الماری میں کتابیں رکھنے لگتی ہے)

کانت۔ مَیں نے . . . . .

رتنی۔ یہ کسی کرشمہ سے کم نہیں۔ اس وقت کس میں دم تھا کہ گھر سے باہر نکلتا۔ لیکن گوبند کو جب معلوم ہوا کہ رائے دھنی رام کا مکان لوٹا جا رہا ہے تو وُہ بیدھڑک اپنے

دو ساتھیوں کو لے کر چل پڑا۔ ڈاکوؤں نے آتے آتے مکانوں کی کنڈیاں باہر سے لگا دی تھیں۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ کنڈیاں کھول دیں اور اپنے ساتھیوں کو جا جگایا اُنہیں شرم دلائی کہ ان کے شاہ کا مکان لوٹا جا رہا ہے اور وہ گھروں میں دبکے پڑے ہیں۔ کیا اس طرح چپ پڑے رہنے سے اُن کا سر ہمیشہ کیلئے نیچا نہ ہو جائیگا کسی دوسرے گاؤں والے کے سامنے کیا وہ سینہ تان کر چل سکیں گے۔ دنگلوں میں گبروؤں کو للکار سکیں گے؟ اور سب کو ساتھ لے کر وہ ڈاکوؤں کے انتظار میں گاؤں کے موہانے پر جا کھڑا ہوا۔

کانت۔ میں رات بہت دیر تک پڑھتا رہا تھا، اس لئے سو گیا تھا۔

رتنی۔ تم جاگ کر بھی کیا کر لیتے۔ جب سارا گاؤں باہر آ گیا تھا تب بھی تم نہ آئے۔

کانت۔ میں . . . . .

رتنی (طنز سے) تم اپنے خیالات کے ڈنگر چرا رہے ہو گے (جھرجھری لیتی ہے) میں ساری عمر وہ نظارہ نہیں بھول سکتی۔ ڈاکو سامان سے بھری موٹر لے گئے لیکن اُن کے چار ہمراہیوں کو گوبند اور اُس کے ساتھیوں نے الجھا لیا اور وہ لڑائی (پھر جھرجھری لیتی ہے) میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

کشنی (الماری میں کتابیں چنتے چنتے) سر پر توے باندھ کر آئے تھے ڈاکو۔

رتنی۔ اور پھر اُن کی لاٹھیاں پورے دالی تھیں۔ ہر ایاں پڑی ہوئی تھیں ان میں۔ جس کے ایک پڑ جاتی وہ پھر نہ اُٹھتا۔ شور سنکر اور گاؤں والے آ گئے۔ لیکن کیا مجال ہے جو کوئی ڈاکوؤں کو چھو پاتا۔ ایسی لاٹھی چلاتے تھے وہ (لمبا سانس لیتی ہے) وہ سانستی مر گیا۔ نگر اُس کی بہادری مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ بجلی کی سی تیزی سے

اُس کی لاٹھی گھومتی تھی۔ مجھے یاد ہے، تین بار ڈاکوؤں نے گاؤں والوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا ـــــ اگر ایک لاٹھی کے وار سے گرتا تو چار خون سے گر پڑتے۔ گوبند کے ساتھی زخمی ہو گئے۔ لیکن وہ ڈٹا رہا اور وہی تھا جس نے اس سانسی کو مار گرایا۔ مرتے وقت اُس نے کہا تھا "میں اس بہادر کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں جس نے مجھے گرایا۔"

کِشنی۔ پچاس ڈاکے وہ اب تک ڈال چکا تھا۔

رتنی۔ مرنے سے پہلے گوبند کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اُس نے کہا تھا "زندگی نہیں رہی دوست، نہیں تو تُو میرے ساتھیوں میں ہوتا۔"

(جوش سے ایک دو بار کمرے میں چکر لگاتی ہے۔ کشنی کتابیں رکھ کر جانے لگتی ہے)

رتنی (کشنی سے) کشنی ذرا دیکھنا۔ گوبند تھانے سے آیا ہے یا نہیں۔

کِشنی۔ مجھے تو بھوک لگی ہے، میں پہلے جا کر کھانا کھاؤں گی ـــــ صبح بھی کھانا کھائے بغیر گئی تھی......

رتنی۔ بڑی اچھی ہے میری کشنی بہن۔ ذرا دیکھنا جا کر، میں جاننا چاہتی ہوں ـــــ کتنے ڈاکو پکڑے گئے ہیں اور کتنے باقی رہ گئے ہیں۔

کِشنی۔ جسوا ابھی یہاں آئیگی۔ وہ آتے آتے ضرور خبر لے کر آئیگی۔ میں تو جا رہی ہوں۔

(چلی جاتی ہے)

رتنی۔ وہ ایک کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ اُس نے کہا تھا رتنی، میں ایک ایک کو چُن کر لاؤں گا۔ پولیس کے بھروسے رہے تو مل چکے ڈاکو، اور تشاہ ابھی تک

آئے نہیں اور وُہ اپنے ساتھیوں کو ساتھ لیکر پولیس کیساتھ چلا گیا۔
اس کا جسم لہو لہان ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی مرہم پٹی کی تو ہنس کر کہنے لگا "یہ تو معمولی چوٹیں ہیں رتنی، ایسی تو کھیل کھیل میں لگ جاتی ہیں"

کانت (طنز سے ہنس کر) جب تم جیسی کوئی لڑکی پٹی باندھ رہی ہو تو نوجوانوں کے گہرے زخم بھی معمولی خراشیں بن جاتے ہیں۔

رتنی۔ بیکار بیٹھے بیٹھے تم میں زہر بھر گیا ہے اور کچھ نہیں۔

کانت۔ زہر.....

(ہنستا ہے)

رتنی۔ اور میں کئی بار سوچتی ہوں کہ راجہ ہوتا تو اُس کا بل دیکھتی۔ بڑی ڈینگیں مارا کرتا ہے۔ گو بند کو لڑتے دیکھتا تو لاٹھی اُٹھانے کا خیال چھوڑ دیتا۔

کانت۔ راجہ.....

رتنی۔ وُہ ہمیشہ اپنے بل پراکرم کے متعلق گپیں ہانکا کرتا ہے۔ ہوتا تو اُسکی آزمائش ہو جاتی

کانت۔ راجہ طاقتور آدمی ہے۔

رتنی۔ جب تک موقع نہ پڑے سبھی طاقتور ہوتے ہیں۔

کانت۔ لیکن اب تک تو تم اُسکی بہادری کے گیت گایا کرتی تھیں۔ میں تو بھلا ایک دبلا پتلا خیال کی دُنیا میں بسنے والا آدمی ہوں لیکن راجہ.....

رتنی۔ میں نے بہادری کا نام سُنا تھا۔ اُسے آنکھوں سے نہ دیکھا تھا (پھر جھرجھری لیتی ہے) میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے کبھی ایسی لڑائی نہیں دیکھی۔ قصے کہانیوں میں ضرور ڈاکوؤں کا حال سنتی تھی۔

سوچا کرتی تھی ـــــ کس طرح دس پندرہ ڈاکو سارے گاؤں کو خوفزدہ کر کے سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے ہیں۔ لیکن اس رات میں نے خود دیکھا....

کانت۔ تم رات کی بات کرتی ہو۔ وہ دن دہاڑے سب کچھ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔

(کھوکھلی ہنسی ہنستا ہے)

رتنی۔ ابھی میری آنکھ ہی لگی تھی کہ میں نے بندوقوں کی آواز سُنی۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے سارے گاؤں کو سانپ سُونگھ گیا ہو۔ نمبردار کے گھر سے توے والے باجے کی آواز آرہی تھی۔ سدّنا اپنی ترنگ میں مست گا رہا تھا۔ لیکن بندوقوں کی آواز سنتے ہی سب گھُٹی سادھ کر رہ گئے۔ میرا جی دھڑکنے لگا۔ مَیں نے کروٹ بدلی۔ پھر بندوق کے فائروں کی آواز آئی۔ رات کے سناٹے میں وُہ آواز دُور تک گونجتی ہوتی چلی گئی اور پھر سنّاٹا جیسے اور بھی گہرا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ہوا بھی ڈر کر تھم گئی ہو۔ میرا دل بیٹھنے سا لگا جی کڑا کر کے میں اُٹھی اور کھڑکی میں آئی۔

کانت۔ لیکن میں نے سُنا ہے کہ بلبیر باہر بیٹھا تھا۔ شور نہ مچایا اس لیے؟

رتنی۔ بلبیر نے چور بتّی جلائی تھی اور اُس کی روشنی میں مَیں نے دیکھا ـــــ دس بارہ آدمی سروں پر مُنڈاسے باندھے آرہے ہیں۔ اُن کے چہرے ڈھاٹوں کی وجہ سے دکھائی نہ دیتے تھے۔ آگے آگے چلنے والوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں ان میں سے ایک نے فائر کیا۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں ـــــ دوسرے پل مَیں نے دیکھا، بلبیر کی مشکیں کسی ہوئی ہیں ـــــ اچانک سب کچھ میری سمجھ میں آگیا۔ مَیں بھاگ کر ماما کے کمرے میں گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں ماما سے کچھ کہتی۔ ڈاکو آگئے۔

کانت۔ مامی نے شور نہ مچایا۔

رتنی۔ اُن کے پاس بندوقیں تھیں۔ جو کسی نے چُوں بھی کی تو اُسے گولی ماردی جائیگی" اُنہوں نے کہا اور بندوقیں دکھا کہ چابیاں مانگیں۔ مامی نے کہا" ہمارے آدمی ساتھ لے گئے ہیں۔ ہمارے پاس چابیاں کہاں"۔ تب ڈاکو بندھے ہوئے بلبیر کو ساتھ لے آئے اور اُسے دھرتی پر لٹا دیا ــــــ اس سے پہلے کہ ڈاکو بندوق اُٹھاتے۔ مامی نے چابیاں پھینک دیں۔ چار لڑکیوں کے بعد ترس ترس کر پایا ہوا بیٹا ــــــ " اسے کچھ نہ کہو اور جو لینا ہے لے جاؤ"۔ مامی نے کہا اور مُنہ پر ہاتھ رکھ لیا ــــــ گیرج سے ڈاکوؤں نے موٹر نکالی اور سامان لوٹنے لگے ایک ڈاکو بندوق لے کر ہمارے سامنے کھڑا رہا۔ ناٹا سا قد، میلا پھٹا تہ بند اور قمیص ــــــ میں سمجھتی تھی کہ ڈاکو بہت بھیانک، لمبے تڑنگے، راکششوں سے ڈراؤنے آدمی ہوں گے۔ لیکن اُسے دیکھ کر تو مجھے مایوسی ہوئی۔ ایک دو بار میرے جی میں آئی کہ ایک ہی بار اُچھل کر اس کا گلا پکڑ لوں اور اتنا گھونٹوں اتنا گھونٹوں کہ اس کا دم نکل جائے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے اپنے آپ کو روکا کہ کہیں ڈاکو بلبیر کو نہ ماردیں اور مامی میرا جینا دُوبھر کردیں ــــــ ڈاکوؤں نے سب کچھ لوٹا اور موٹر میں ڈال کر چل دیئے۔

(کانت کھڑکی میں بیٹھا صرف ٹانگیں ہلاتا ہے)

رتنی (کمرے میں خاموشی سے ایک دو چکر لگا کر) جب وہ ذرا دور چلے گئے تو مامی نے شور مچانا شروع کیا اور تب لوگ گھروں سے باہر نکلے اور "کیا ہوا" "کیا ہوا" کہتے ہوتے اکٹھے ہو گئے ــــــ بھگوڑے ــــــ مجھے ان پر بے حد غصہ آیا جی میں

آئی کہ بندوق اگر ہاتھ میں ہو تو سب کو بھون دوں
(جوش سے ایک دو بار پھر کمرے میں گھومتی ہے)
——تبھی ایک شخص بھاگا بھاگا آیا اور اُس نے بتایا کہ گوبند اور اُس کے ساتھیوں نے ڈاکوؤں کو گھیر لیا ہے اور پھر جو جس کے ہاتھ میں آیا۔ لے کر بھاگا۔ میں بھی اس بھیڑ بھاڑ میں چپ چاپ کھسک گئی۔ راجہ ہوتا تو دیکھتی اُس میں کتنا دم ہے تم کہتے ہو کہ وہ بہادر ہے۔ لیکن اکھاڑوں کی بہادری اور لڑائی کی بہادری میں فرق ہے اکھاڑوں میں اپنی لاٹھیوں کے جوہر دکھانے والے کئی بہادر اُس دن جی چھوڑ گئے
(کانت چپ چاپ سیٹی بجاتا ہے)
——دھن میں پلی ہوئی بہادری کا نرتا ہی کا دوسرا روپ ہے۔
(کانت طنز سے ہنستا ہے)
——کیا میں غلط کہتی ہوں۔ کیا . . . .

کانت۔ (کھڑکی سے اُتر کر کمرے میں گھومتا ہے) پنچھی کو پر لگ گئے ہیں۔ وہ اب بہت دیر تک گھونسلے میں نہ رہیگا۔

رتنی۔ تم کیا کہتے ہو، تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔

کانت۔ وہ تمہاری سمجھ میں آنے کے لئے نہیں ہیں۔

رتنی۔ تو پھر . . . . .

کانت۔ سوچتا تھا کہ کہیں تم خود ڈاکوؤں کے گروہ میں نہ شامل ہو جاؤ۔

رتنی (ہنستی ہے) ہیں . . . . .

کانت۔ تمہاری زبان سے ڈاکے کا حال سنتے سنتے ایسا معلوم ہوا جیسے تم نے

اس ڈاکے میں حصّہ اٹھایا ہے۔ . . . جیسے اس ڈاکے سے تمہیں ذرا بھی خوف نہیں آیا۔

رتنی۔ خوف۔؟

کانت۔ تمہاری ماں کو غش آ رہے ہیں۔ تمہارے گھر پر ہراس چھایا ہوا ہے۔ سارا گاؤں ڈر کے مارے سہم گیا ہے۔ لیکن . . . . .

رتنی۔ ڈاکے والے تو پکڑے گئے ہیں اور جو ہیں وہ پکڑے جائیں گے۔

کانت۔ لیکن . . . .

رتنی۔ اور شاید سامان بھی مل جائے۔

کانت۔ لیکن تم . . . . .

رتنی۔ میں اُن کی بہادری کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتی (جھرجھری سی لیتی ہے) میں کبھی نہیں بھول سکتی وہ . . . . . .

کانت۔ اور اگر وہ تمہیں اُٹھا کر لے جاتے . . . . .

(جسودا جلدی جلدی داخل ہوتی ہے)

جسودا۔ رتنی کچھ سُنا تم نے . . . .

رتنی۔ کیا؟

جسودا۔ ڈاکو تمہیں اُٹھانے آئے تھے۔

رتنی۔ (ہنستی ہے) تم سے کس نے کہا؟

جسودا۔ سارے گاؤں میں اس بات کا چرچا ہو رہا ہے اور مجھے گوبند نے بھی یہی بتایا ——— باقی سب ڈاکو پکڑ لئے گئے ہیں ——— ایک چوڑی چاندی کا تھا۔ دو ماجرے کے تھے اور ایک ہمارے ہی گاؤں کا تھا . . . .

رتنی۔ ہمارے ہی گاؤں کا؟

جسودا۔ بس ڈاکہ ڈالنے کے بعد چپ چاپ اپنے گھر میں جاکر سو گیا۔

رتنی۔ لیکن تھا کون؟

جسودا۔ تنگل۔

کانت اور رتنی۔ تنگل ——

جسودا۔ ہاں وہی تنگل چرواہا۔

رتنی۔ کمینہ میں سمجھتی تھی اب وہ سدھر گیا ہے۔ جب بھی اس کے باڑے کے پاس سے گذرتی تھی تو طرح طرح کے آوازے کسا کرتا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں چپ رہی، پر ایک دن مجھے غصّہ آگیا اور گردن پکڑ کر میں نے اُسے پیٹ دیا۔

جسودا۔ تبھی جب بھیا گوبند سے بھی اُس کی ہاتھا پائی ہوگئی تھی۔

رتنی۔ اور ماں نے مجھ پر سو سو لانچھن لگائے تھے۔

جسودا۔ تبھی سے تم سے وہ خار کھائے بیٹھا ہے۔ گوبند نے بتایا ہے کہ تنگل نے ڈاکوؤں کو اس شرط پر ہی تمہارے گھر کا سب بھید دینے کا وعدہ کیا تھا کہ وہ گھر کو لوٹنے کے علاوہ تمہیں اُٹھا کر لے جانے میں بھی اُس کی مدد کریں اور بھیا تو بتاتے تھے کہ در اصل تنگل ہی ڈاکوؤں کو بُلا کر لایا تھا۔

رتنی۔ کمینہ . . . . .

جسودا۔ اُنہوں نے اُسے تسلّی دی تھی کہ ہم رتنی کو اُٹھانے میں مدد کریں گے لیکن اس سے اپنا کام نکال کر اُنہوں نے تمہیں اُٹھا کر لے جانے سے انکار کر دیا "دھن مال تو چھپایا جا سکتا ہے۔" ان کے سردار سانستی نے کہا تھا۔ "لیکن اسکو

کہاں چھپا کر رکھیں گے"۔ ابھی تمہارے ماما کے سامنے تھانے میں ایک ڈاکو نے یہی بیان ......

کانت۔ رتنی کے ماما آگئے۔

رتنی (انتہائی نفرت سے) رذیل .....

کانت (ذرا ہنس کر) اب تم چاہے اس کو ہزار گالیاں دے لو۔ اگر وُہ تمہیں اُٹھا کر لے جاتے ....

(ہنستا ہوا چلا جاتا ہے)

رتنی۔ اگر وُہ مجھے اُٹھا کر لے جاتے (مٹھیاں بھینچ کر) اگر وُہ مجھے اُٹھا کر لے جاتے (پھر مٹھیاں ڈھیلی چھوڑ کر) میں خوش ہوتی ....

جسودا۔ کیا کہتی ہو رتنی ....

رتنی (بھرے ہوئے گلے سے) تمہیں معلوم نہیں جسودا، جونہی مامی کو اس بات کا پتہ لگیگا وُہ ڈاکے کا الزام سب مجھ پر ہی دھر دیں گی۔ پہلے ہی وُہ مجھے ہمیشہ کوستی رہتی ہیں کہ جب سے یہ لڑکی گھر میں آئی ہے بپت پر بپت آ رہی ہے ـــــ بلبیر کو زکام ہو جائے میری وجہ سے۔ ماما کو خسارہ آ جائے میرے بُرے سائے کے کارن۔ مامی کی کمر میں درد ہونا شروع ہو جائے میری بُری نظر کی بدولت ـــــ (سسکتی ہے) میں کہتی ہوں ماما مجھے کیوں میری مرتی ہوئی ماں کی گود سے اُٹھا لائے، کیوں نہ مجھے اُس کے ساتھ ہی مر جانے دیا (اور بھی زور سے سسکتی ہے) کیا اس طرح مجھے روز سوئیاں چبھونے کیلئے، روز میرے دل میں کچوکے دینے کیلئے۔

جسودا۔ صبر کرو ....

رتنی۔ وُہ تو پہلے ہی تین دن سے میری بدبختی کو، میرے بُرے سائے کو کوس رہی ہیں
—— اب جب اُنہیں پتہ چلا کہ یہ ڈاکہ رتنگل نے میرے ہی کارن ڈلوایا ہے
تو کیا وُہ مجھے جینے دیں گی۔ جانتی ہو، جب میں نے رتنگل کے مُنہ پر تھپڑ لگایا تھا، تو
اُنہوں نے میری کتنی بدنامی کی تھی اور اب —— اب وُہ کیا باتیں نہ بنائینگی

(عقب میں دُور چرواہوں کے گانے کی آواز آتی ہے)

ہے جی ہاں آں، ہاں آں، ہاں آں، ہاں ——
مہارا جنگل کا سب ساج، سدا رہتی ہے دُوب ہری۔
سدا رہتی ہے دُوب ہری ——
سدا رہتی ہے دُوب ہری ——

رتنی (لمبی سانس لیتی ہے) اوہ! کہیں میں ان چرواہوں کی طرح آزاد ہو کر ——
ان روز روز کے طعنوں، مہنوں، کوسنوں اور لانچھنوں سے آزاد ہو کر اس
روز روز کی غلامی اور بے بسی سے مکتی پا کر، اِن چرواہوں کی طرح گاتی ناچتی
گھوم سکتی (اچانک مڑتی ہے) تمہارے بھیّا ابھی گھر نہیں آئے جسودا۔

جسودا۔ بھیّا آ گئے ہیں ان ہی کا سندیسہ لے کر تو میں آئی تھی۔ اُنہوں نے کہا ہے
رتنی سے کہنا، مَیں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

رتنی۔ تم اُن سے جا کر کہو کہ میں ملنے آتی ہوں، کہیں جائیں نہیں۔

جسودا۔ اُنہوں نے کہا تھا، رتنی سے کہنا۔ اگر آئے تو مجھے بالو کے کنوئیں کے پیچھے
رشو کے مندر میں ملے۔

رتنی۔ بالو کے کنوئیں ......

جسودا۔ وہی جو اسٹیشن کے پاس ہے۔ گھر پر تو بھیڑ سی لگی رہتی ہے، ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔

رتنی۔ تم جاؤ۔ کہنا میں ابھی دس منٹ میں آرہی ہوں۔ میں تو اُن سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ کس طرح ڈاکو پکڑے گئے، کیسے پکڑے گئے۔ سب کچھ میں اُن سے سُننا چاہتی ہوں۔

(جسودا چلی جاتی ہے۔ چرواہوں کے گانے کی آواز اور نزدیک آجاتی ہے)

کسی کے رے موٹر گھوڑا سے رے گڈّی
کسی کے رے سُندر محل سے رے مڈّھی
مہارامن کا تخت رے تاج کریں گے ہو ہیڑا پار ہری
ہے جی ہاں آں، ہاں آں، ہاں ——

(ایک لمحہ کیلئے یہ آواز سٹیج پر چھا کر پھر خاموش ہو جاتی ہے)

رتنی (بے چینی اور جوش سے کمرے میں تیز تیز گھومتی ہے) اوہ اوہ میں اس قید میں نہیں رہ سکتی، میں یہ روز روز کی ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔ ابھی مامی کو پتہ لگ جائیگا کہ رنگل میری خاطر ڈاکے والوں کو بُلا کر لایا تھا اور سب کو سنے طعنے پھر جاگ اُٹھیں گے، زہر میں بجھے ہوئے نشتروں کی طرح میری نس نس کو چھید دیں گے ......

مامی (باہر سے) میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اگر یہ کلموہی اس گھر میں رہی تو نہ جانے، کون کون سی مصیبت کا مُنہ اس گھر کو دیکھنا پڑے گا؟

رتنی (جلدی جلدی بائیں طرف کے دروازے سے نکلتی ہوئی) اوہ، بس بھری زبان

—لیجئے مامی ادھر ہی آرہی ہیں۔

(جلدی سے نکل جاتی ہے)

ماما۔ (باھر سے) اس میں اس بیچاری کا کیا قصور ہے۔

مامی (باہر سے) اس کا نہیں تو اور کس کا ہے۔ نہ جانے دن بھر کہاں کہاں آنکھیں مٹکاتی پھرتی ہے۔ حیا شرم تو اُس نے جیسے بیچ کر کھا لی ہے۔

(رتنی کے ماما رائے دھنی رام، مامی، ابوا، کانت، گنتو اور ایک دو عورتیں داخل ہوتی ہیں۔ ماما اور مامی آگے آگے ہیں اور باقی سب پیچھے پیچھے، ماما کانت اور ابوا کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں، مامی کھڑکی میں بیٹھتی ہے۔ باقی سب کھڑے رہتے ہیں)

ماما (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) بلبیر کی ماں تم کیسی باتیں کرتی ہو۔

مامی۔ میری باتیں تو ہمیشہ آپ کو زہر لگتی ہیں۔ بیٹا رلٹر کی گھر میں آرام سے بیٹھتی ہے۔ اس کی طرح گلیوں کی خاک نہیں چھانتی پھرتی، میں تو اُسی دن روتی تھی جس دن تنگل کے مُنہ پر اس نرلج لڑکی نے تھپڑ رسید کئے تھے۔ اسی دن میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ بے حیا ضرور کوئی نہ کوئی گُل کھلائے گی۔ میرے بھی تو آخر لڑکیاں ہیں۔ اُنہیں کیوں نہیں کوئی چھیڑتا۔ مکھیاں وہیں منڈلاتی ہیں جہاں شہد ہوتا ہے۔

ماما۔ تم کیوں فضول ہی اس کو کوس رہی ہو۔ کسی میں حوصلہ ہوتا ہے، کسی میں نہیں کوئی کسی بدمعاش کی دو باتیں سُنکر چُپ ہو جاتی ہے، کوئی چپ نہیں رہ سکتی۔

مامی۔ آپ کی اس شہ ہی نے تو اُسے اتنی جرأت دلائی ہے کہ وہ ہرایرے غیرے کے مُنہ آتی پھرے۔ تنگل . . . . .

ماما (کرسی سے اٹھتا ہوا جل کر) رنگل بدمعاش ہے۔

مامی (منہ بچکا کر) اور یہ بھلی مانس۔ ایک بگڑے بدمعاش چرواہے سے الجھنا کہاں کی بھلمنساہت ہے۔ شریف لڑکیاں اپنی آبرو کی زیادہ پروا کرتی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو لاج سے مر جاتی ہیں۔ اس کی طرح غنڈوں سے الجھتی نہیں پھرتیں۔ ڈھنڈورا نہیں پیٹتی پھرتیں (اور منہ بچکا کر ——) دیکھ لیا نا اپنی اس لاڈلی کی بھلمنساہت کا نتیجہ (رونے لگتی ہے) نا بھائی مجھ کو ایسی بھلمنساہت نہیں چاہیئے۔ اب تو ایشور کی دیا سے سب کچھ مل گیا۔ نہیں تو ہم لٹ گئے تھے (اور بھی بھرائی ہوئی آواز میں) جب ڈاکوؤں نے بلبیر کو دھرتی پر لٹایا اور بندوق چلانے لگے تو میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے، نا بابا۔ یہ بھلمنساہت ہمیں راس نہ آئیگی۔ آج رنگل آیا ہے۔ کل کوئی اور چڑھ دوڑے گا اور . . . .

ماما (پھر کرسی پر بیٹھتا ہوا) تو کیا میں اسے بھٹی میں جھونک دوں۔

مامی۔ (آنسو پونچھتی ہوئی) بھٹی میں کیوں جھونک دیں۔ مٹیار ہو گئی ہے۔ ہاتھ پیلے کر دیں۔ اپنے گھر جائے اور میرے گھر سے یہ برا سایہ ٹلے۔

کانت۔ برا سایہ . . . . (ہنستا ہے)

مامی۔ تم نہیں جانتے بیٹا جب سے یہ کلچھنی آئی ہے، گھر پر بیماری اور مصیبت کی چھایا منڈلا رہی ہے۔ اتنی دیر ہو گئی۔ بڑے سکھ چین سے زندگی بسر ہو رہی تھی کبھی کاہے کو ایسی باتیں دیکھی سنی تھیں اور آپ اٹھا لائے اسے، بھلا اس کے سسرال والے مر گئے تھے —— تلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔ ادھر یہ لڑکی اٹھا لائے۔ ادھر انکے بہنوئی نے دوسری شادی کر لی۔

کانت۔ لیکن ......

مامی۔ تم نہیں جانتے بیٹا۔ بعض بچوں کا سایہ منحوس ہوتا ہے۔ بعض بچے آتے ہیں خوشحالی اور برکت ساتھ لاتے ہیں۔ بعض آتے ہیں، نحوست اور مصیبت ساتھ لاتے ہیں۔ ملاوی کی بھتیجی ہی کو دیکھ لو ـــــ جب سے گھر میں آئی ہے بیچاری پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ پہلے شوہر مرا پھر دیکھتے دیکھتے جوان بیٹا ہیضے کا شکار ہو گیا۔ پھر چرنی پر کھڑی گائے اپھارے سے گر کر مر گئی۔ وہ تو شکر ہوا کہ جلدی ملاوی کو اُس سے چھٹکارا مل گیا۔ نہیں تو جانے اب تک کیا کیا مصیبتیں اُسے اُٹھانی پڑتیں۔

ماما۔ اچھا ہوا جلدی مر گئی، نہیں تو جانے کس عذاب سے مرتی۔

مامی (سُنی ان سُنی کر کے) اور پہلے ہی آتے تھے تو پالا پوسا۔ اب اُسے کہیں کنارے لگائیں۔

ماما۔ تو کہاں بھاڑ میں جھونک دوں۔ لڑکا بھی ملے۔ یونہی کہیں ایسی ویسی جگہ بیاہ دوں تو ساری عمر لڑکی کی روتے بیت جائے اور بہن کی آتما ......

مامی (مُنہ بچکا کر) بہن ہوتی تو نہ جانے کس شہزادے کے ساتھ اپنی اس بیٹی کی شادی کرتی۔

(عقب میں گاڑی کے اسٹیشن پر آنے اور رُکنے کی آواز آتی ہے۔
انجن شاں شاں کرتا ہے)

ماما۔ شام کی گاڑی تو آ گئی۔ برندا بن آ ہی رہا ہو گا۔ جب ڈاکے کا حال سُنا تو ہم بیٹھے حساب کر رہے تھے ـــــ اُس نے کہا ـــــ "تم چلو، میں ابھی

تمہارے پیچھے گاڑی میں آتا ہوں۔

بوا۔ میں کہتی ہوں بیٹا، راجہ کے پتا سے کیوں نہیں رتنی کیلئے پوچھ کر دیکھتے۔

ماما۔ لڑکا آزاد خیال ہے بوا۔ میں نہیں چاہتا کہ وُہ انکار کر دے ـــــ ایک بار باتوں باتوں میں میں نے شانتی کے لئے اس کا دل ٹٹولا تھا۔ اُس نے کہا تھا چاچاجی میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ گاؤں کا معاملہ ہے اور مُنہ سے بات کہکر میں گنوانا نہیں چاہتا۔

(عقب میں گاڑی کی سیٹی اور پھر اُس کے چلنے کی آواز آتی ہے)

کانت۔ لیکن دو سال میں تو ـــــ وُہ کسی نے کہا ہے نا ـــــ پُل کے نیچے سے کافی پانی نکل جاتا ہے۔

بوا۔ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہے۔ من آئے سو کرتا ہے۔ باتوں باتوں میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا کہ وُہ رتنی کو پسند کرتا ہے۔ اگر تم اس کے پتا سے پوچھ دیکھتے۔

(راجہ جلدی جلدی داخل ہوتا ہے۔ سانس پھُولا ہوا ہے)

راجہ۔ میں نے یہ کیا سُنا چاچاجی۔ یہ کس بدمعاش کی کارستانی ہے۔ پچھلے پچاس برس میں گاؤں میں کبھی ایسی بات نہیں ہوئی۔ میں تو ماجرے گیا ہوا تھا۔ وہیں مجھے پتہ چلا۔ اُسی وقت کار لے کر میں چل پڑا۔ آخر کچھ پتہ چلا۔ یاری چوری تو بغیر وسیلے کے نہیں ہوتی۔ کِس پر شک ہے آپ کو۔ میں تو سالوں کا .....

ماما۔ تمہاری مہربانی ہے بیٹا۔ تنگل کی بدمعاشی تھی۔ اُسی نے ڈاکوؤں کو بُلایا اور اُن کو سب بھید بتایا تھا۔ لیکن ڈاکو پکڑے گئے ہیں۔ گوبند نے بڑی بہادری سے

مقابلہ کیا۔ ڈاکو پکڑے گئے ہیں اور سامان بھی مل گیا ہے۔

راجہ۔ مَیں ہوتا تو ایک کو بھی نہ جانے دیتا۔ سب کو بھون کر رکھ دیتا۔

کانت۔ ان میں بھی اکثر کے پاس بندوقیں تھیں۔ رتنی کہتی تھی۔۔۔۔

راجہ۔ اُسے دیکھا نہیں، کہاں ہے وُہ۔ کیا کہتی تھی۔۔۔۔۔

(برنداین گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

برنداین۔ مَیں کہتا ہوں دھنی رام یہ رتنی گوبند کیسا تھ کہاں گئی ہے؟

ماما۔ رتنی۔۔۔۔۔

برنداین۔ مَیں نے ابھی چلتی ہوئی گاڑی میں اُسے گوبند کے ساتھ بیٹھے دیکھا ہے۔

ماما۔ (اٹھ کر) کیا کہتے ہو۔۔۔۔۔

برنداین۔ ہم گاڑی سے اُتر کر باتیں کرتے ہوئے لائن لائن چلے آ رہے تھے کہ گاڑی ہمارے پاس سے گذری اور ہم نے رتنی اور گوبند کو ایک ڈبے میں ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر رتنی چونک کر پیچھے ہٹی۔ لیکن میں نے پہچان لیا۔

ماما۔ کنتو، موٹر تیار کرو!

(جلدی جلدی نکل جاتے ہیں)

مامی۔ مَیں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ لڑکی کُل کو کالکھ لگائیگی۔

(ماتھا ٹھونکتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ سب اُس کے پیچھے چلی جاتی ہیں)

راجہ۔ رتنی، گوبند کے ساتھ بھاگ گئی —— اس مفلس یتیم کے ساتھ جس کا کام

اپنے چچا کے ڈھور ڈنگر چراتا ہے۔

کانت۔ جب چچا کسی یتیم بھتیجے کی زمین جائداد پر قبضہ کرلے تو غریب بھتیجے کیلئے ڈنگر چرانے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں رہ جاتا اور پھر رتنی تو چرواہوں کی زندگی کو پسند کرتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے کہتی تھی ۔۔۔۔

راجہ (غضبناک ہوکر) میں نے بھی بچپن میں بہتیرے ڈھور ڈنگر چرائے ہیں، اور میں جانتا ہوں جب میری گائے کوئی دوسرا باندھ کرلے جائے تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔

(تیزی سے نکل جاتا ہے)

کانت (اُٹھ کر انگڑائی لیتا ہوا) زندگی ۔۔۔ زندگی ۔۔۔۔ جوانی!

(عقب میں چرواہوں کے گانے کی آواز آتی ہے جو آہستہ آہستہ اسٹیج پر چھا جاتی ہے)

ہے جی ہاں آں، ہاں آں، ہاں آں، ہاں ——

(کانت کی انگڑائی کے دوران میں پردہ گر جاتا ہے)

میمونہ

افراد

میمونہ	فریدہ	شیما
آمنہ	ارشد	خیرن بی
	بتولن	

(پردہ مکان کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں اُٹھتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں دائیں طرف ایک دروازہ ہے جو برآمدے میں کھلتا ہے۔ اس برآمدے میں، بائیں طرف نیچے سے سیڑھیاں آتی ہیں اور دائیں طرف باورچی خانہ ہے۔ لیکن سیڑھیوں یا باورچی خانے کے دروازے اس کمرے سے نظر نہیں آتے۔ ہاں برآمدے کا جھروکہ صاف دکھائی دیتا ہے ـــــ اور اس جھروکے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوپہر کا وقت ہے اور باہر سورج خوب چمک رہا ہے سامنے کی دیوار کے بائیں طرف بھی ایک دروازہ ہے جو باورچی خانے کو جاتا ہے ـــــ دوسرے معنوں میں باورچی خانہ، برآمدے اور کمرے دونوں میں کھلتا ہے۔

دائیں دیوار کا دروازہ ڈرائینگ روم (DRAWING ROOM)
کو جاتا ہے اور بائیں دیوار کا دوسرے کمرے کو جو سونے اور آرائش و
زیبائش کے لئے وقف ہے۔

یہ کمرہ ایک طرح کا ڈائینگ روم (DINING ROOM) ہے
کیونکہ اس میں سامنے کے دونوں دروازوں کے درمیان ایک ڈائنگ ٹیبل
پڑا ہے۔ جس کے چاروں طرف کرسیاں رکھی ہیں جو پردہ اُٹھتے وقت
میز کے نیچے ہیں۔ صرف ان کی پشتیں نظر آ رہی ہیں

دائیں اور بائیں دیواروں میں دروازوں کے دونوں طرف دو الماریاں
ہیں۔ جن کے شیشوں سے چائے اور کھانے کے سیٹ دکھائی دیتے ہیں۔
برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے علاوہ باقی سب پر پردے
پڑے ہوئے ہیں۔

خیرن بی دروازے کی چوکھٹ میں پاؤں پسارے بیٹھی میمونہ کو چپ
کرا رہی ہے۔ لیکن وہ اس کی گود میں منہ چھپائے برابر سسکے جا رہی ہے)
خیرن (اسے چمکارتے ہوئے) نہ میری ممّو۔ بس بس بھلا اس طرح بھی جی چھوٹا کئے
کرتے ہیں۔ ارے وہ آنے والے ہی ہوں گے۔

(میمونہ زور سے سسکتی ہے)

—— (اپنے آپ) اس بیچاری کا بھی کیا قصور ا بیگم تو اس طرح سلوک کرتی ہیں
جیسے اپنی جائی نہ ہو۔ کہیں سے گری پڑی اُٹھا لائی ہوں (پاؤں سکیڑ کر میمونہ
کو تھپتھپاتے ہوئے) بس بس۔ اب کوئی دم میں آجائیں گے۔ چل تجھے

نرگس کے پھولوں کا گلدستہ بنا دوں —— خوبصورت پیلے پیلے سفید پھولوں کا۔

(میمونہ اور بھی زور سے سسکتی ہے۔ خیرن بی برآمدے میں جاتی ہے اور دوسرے لمحے پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بنا لاتی ہے۔ میمونہ اُسی دالان میں وہیں بیٹھی برابر سسکتی رہتی ہے)

—— (اسے گلدستہ دیتے ہوئے) لے بیٹیا، دیکھ کتنے خوبصورت پھول ہیں (میمو پھول نہیں لیتی۔ اس کی گودی میں سر چھپا لیتی ہے) بچی ہی تو ہے۔ سات آٹھ سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ انتظار کرتے کرتے ذرا سا مُنہ نکل آیا بیٹی کا۔ پپڑیاں جم گئیں ہونٹوں پر۔ لے جاتے ساتھ تو کیا تھا۔

(دُور سے موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دیتی ہے)

—— لو وُہ آگئے

(میمونہ سر اُٹھاتی ہے)

—— سُنو، موٹر کے ہارن کی آواز۔

(عقب میں موٹر ہارن بجاتی ہوئی نکل جاتی ہے)

—— یہ کمبخت موٹریں بھی ایک جیسی آواز نکالتی ہیں

(میمونہ اُس کی گود میں مُنہ چھپا کر سسکنے لگتی ہے)

—— (اُسے تھپتھپاتے ہوئے) اور لے گئیں فریدہ کو بھی ساتھ۔ چھوڑنا تھا تو دونوں ہی کو چھوڑ جاتیں۔ کب سے راہ تک رہی ہے بیچاری۔ نہ صبح سے ٹھیک طرح کھایا نہ پیا۔ وہاں دعوت اڑانے کو کس طرح جی چاہتا ہوگا بیگم کا؟ میرے حلق سے

تو نوالہ بھی نہ اُترے۔

(میمونہ سسکتی ہے)

—— کمبخت شیما کو بھی آج نہ جانے کیا ہو گیا۔ یوں سارا سارا دن یہاں چپکی رہتی ہے۔ فرید نہیں ہے نا یہاں آج۔

(اوپر آسمان میں ہوائی جہاز کی گونج سنائی دیتی ہے)

—— ارے جہاز۔

(میمونہ سسکتی ہے)

—— ارے یہ تو کتنے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اُٹھ دیکھ کھڑکی سے۔

(اُسے اُٹھا کر تیزی سے برآمدے میں جاتی ہے)

—— (جھروکے سے دیکھتے ہوئے) اری ممو بھاگ دیکھ کئی ہیں۔ تین . . . چھ . . . نو . . . . اور دیکھ کتنے نیچے

میمونہ۔ (آنسو نگلتے ہوئے جھروکے کی طرف جاتے ہوئے) نَو . . . .

خیرن۔ دس . . . . گیارہ . . . . بارہ

میمونہ (جھروکے پر پہنچ کر) بارہ!

(ہوائی جہازوں کی گونج قریب سے نکل کر اُوپر آ جاتی ہے اور کچھ لمحوں تک سٹیج پر چھائی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ دور چلی جاتی ہے اور دور سے موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے)

میمونہ (خیرن کے ساتھ واپس آتے ہوئے) بارہ تھے نہ خیرن!

خیرن (جو اس بات پر خوش ہے کہ اس کا دھیان بٹا) ہاں بارہ تھے۔

میمونہ - (آنسو پونچھتے ہوئے نہایت سادگی سے) یہ ہم کیوں نہیں گراتے۔

خیرن (ہنستے ہوئے) ربڑ کے گولے تو نہیں ہوتے بم - ایک بھی گر جاتا تو ہم اور ہمارے ساتھ سب کچھ بھک سا اڑ جاتا۔

(موٹر کے ہارن کی آواز عین قریب سنائی دیتی ہے)

——(پھر واپس جھروکے میں جاتے ہوئے) لے تیری امّی آ گئیں غبارے لائی ہیں ہوا میں اڑنے والے - فرید بھی آ رہا ہے بھاگا ہوا - اور شیما بھی جھانک رہی ہے کمبخت موٹر کی آواز سن کر۔

(میمونہ جھروکے کی طرف جاتی ہے کہ فرید ہاتھ میں دو غبارے لئے آتا ہے)

فرید - ممّو غبارے!

خیرن - اپنی بہن کو بھی ایک غبارہ دے دے فرید بیٹا۔

فرید - ہم نہیں دیتے۔

(اندر کی طرف بھاگتا ہے)

ممّو - کیسے نہیں دیتا۔

(اس کے پیچھے بھاگتی ہے)

خیرن (ان کے پیچھے آتے ہوئے) ارے ممّو . . . ٹھہر . . . میں لے دیتی ہوں . . . . ممّو . . . .

(ممّو فرید کے پیچھے بائیں طرف کے کمرے میں بھاگ جاتی ہے۔ برآمدے میں سے آمنہ داخل ہوتی ہے۔ ہاتھ میں دو چار لفافے اٹھائے ہوئے)

آمنہ۔ خیرن

خیرن۔ (مڑ کر) آ گئیں بیگم، بڑی دیر لگائی۔

(اس کے ہاتھ سے لفافے لیکر ڈائننگ ٹیبل پر رکھتی ہے)

آمنہ۔ میں تو تھک گئی وہاں۔

(ٹیبل کے نیچے سے ایک کرسی نکال کر اس پر دھنس جاتی ہے)

خیرن۔ ارشد میاں کہاں ہیں۔ وُہ نہیں آئے۔

آمنہ۔ راستے میں نصیر کے ہاں رہ گئے۔ چورچور موسیرے بھائی۔ جب دیکھو نصیر جانے کس طرح اس کے ساتھ وقت ذبح کر سکتے ہیں۔ نہ اسے بات کرنے کی تمیز ہے نہ بیٹھنے اُٹھنے کا سلیقہ۔ میں نے کہا "چلئے پھر کبھی آجائیے گا میٹنی دیکھنے چلیں گے۔ ماجد نے کہا تھا۔۔۔ "کہنے لگے" تم کار لے چلو۔ سیدھے کیپٹل پہنچ جانا۔ میں نصیر کے ہاں سے سیدھا وہاں پہنچوں گا۔ ماجد کو فون کر دوں گا۔ لیکن میں پوچھتی ہوں نصیر۔۔۔۔

خیرن۔ میٹنی تو تین بجے شروع ہو جاتی ہے اور اب تو۔۔۔۔

آمنہ۔ دیر ہو گئی راستے میں۔ فرید پڑ گیا پیچھے نمائش دیکھنے کیلئے سو اُتر پڑی۔ کچھ سامان وغیرہ خریدا۔ بس ابھی تیار رہو کہ چلی جاؤں گی ساڑھی ہی تو بدلنی ہے۔

(بتولن کچھ اور لفافے اُٹھائے ہوئے داخل ہوتی ہے اور انہیں بھی لا کر میز پر رکھ دیتی ہے)

—— (بتولن سے) یہ سب اندر رکھ دو اور دیکھو آم برف میں ڈال دینا۔ فرید پڑ جائے گا پیچھے۔

فریدہ۔ میرا غبارہ لے لیا۔ . . (دوسرے کمرے سے فرید کے چیخنے کی آواز آتی ہے)
اں. . . . اں. . . . میرا غبارہ (پیٹنے کی آواز آتی ہے) دے میرا غبارہ۔

(دوسرے لمحے میمونہ ایک غبارہ لئے بھاگتی آتی ہے)

میمونہ (بھاگتے ہوئے) کیوں میں نہ لوں گی غبارہ
آمنہ۔ (اُٹھ کر اسے پکڑتے ہوئے) کیوں ری چڑیل پھر رُلایا تو نے اسے (ایک تھپڑ لگاتی ہے) کتنی بار کہا ہے۔ نہ چھیڑا کر اس غریب کو۔
فرید۔ (ایک ہی غبارہ لئے روتا ہوا بھاگتا آتا ہے) میرا غبارہ . . . میرا غبارہ
آمنہ (اسے گود میں اٹھا کر) بس بس مارا ہے میں نے ممّو کو۔ میرا راجہ بیٹا۔ . . .
لے یہ غبارہ (اسے غبارہ دیتے ہوئے جھولتی ہے) فرید تو میرا بیٹا ہے نا۔ (اسے چومتی ہے) اور میمونہ۔
فرید (خوش ہو کر) خیرن کی بیٹی۔

(شیما شرماتی شرماتی دروازے سے جھانکتی ہے)

آمنہ۔ لے وہ شیما آگئی۔ اب جا کھیل اس کے ساتھ۔
فرید۔ (اماں کی گود سے اُترتا ہوا) شیما غبارہ، آؤ کھیلیں
شیما (اندر آتے ہوئے) پہلے ایک ہمیں دو۔
فرید۔ لو (اسے غبارہ دیتا ہوا) آؤ ادھر کھیلیں۔

(اسے ساتھ لے کر کمرے میں چلا جاتا ہے)

میمونہ (آمنہ کے پاس جا کر بھرائی ہوئی آواز میں) امی
آمنہ۔ کیا ہے ؟

میمونہ (اور بھی بھرائی ہوئی آواز میں) امّی

آمنہ۔ (چڑ کر) پرے ہٹ ممّو گیا اوپر چڑھے آ رہی ہے (اسے پرے دھکیل کر) آتے ہی سر پر سوار ہو گئی۔ اس چڑیل سے کبھی پل بھی چھٹکارا نہیں، بول کیا کہتی ہے

میمونہ (چُپ)

آمنہ۔ اب پھُوٹ بھی مُنہ سے کیا کہتی ہے

(میمونہ رونے لگتی ہے۔ تبولن آموں کا لفافہ لئے رسوئی میں چلی جاتی ہے)

آمنہ۔ اری خیرن کیا آتے ہی اسے میرے پیچھے لگا دیا۔ دو منٹ تجھ سے سنبھال کر نہیں رکھا جاتا تم سے۔ دیکھتی نہیں ہو ابھی آئی ہوں۔ ابھی سانس بھی نہیں لیا کہ یہ امّی کی بچی چمٹ گئی۔ سنبھال اسے۔

خیرن (پیار سے) چل بیٹی۔ چل ادھر فرید بھیا کے پاس . . . .

آمنہ۔ اودھر نہ لے جانا۔ ستائے گی اسے چڑیل۔ اودھرے جاؤ برآمدے میں۔ میں ذرا جا کر یہ ساڑھی بدل ڈالوں۔

(اندر کمرے میں چلی جاتی ہے)

خیرن۔ چل ممّو بیٹی تجھے گڑیا بنا دوں

(میمونہ صرف سسکتی ہے)

—— (اسے پچکارتے ہوئے) رویا نہیں کرتے بیٹی۔ سو دیکھ میں بناتی ہوں گڑیا تیرے لئے

(میمونہ سسکتے سسکتے جا کر برآمدے کے جھروکے میں کھڑی ہو جاتی ہے

تبولن سبزی کی ٹوکری لئے باہر آتی ہے اور لوبیا کاٹنے لگتی ہے)

خیرن (اس کا ہاتھ بٹاتے ہوئے) صبح سے بچّی انتظار کرتی رہی ہے تبولن بی بھی بھلا

ایک غبارہ اس کے لئے بھی لے آئیں تو . . . . . .

بتولن۔ بیگم نے تو دو ہی لئے تھے۔ لیکن فریدہ نے دونوں لے لئے۔

خیرن۔ ذرا پیار ہی کر لیتیں۔ بچّی پیار کو ترس ترس جاتی ہے۔ جا کھڑی ہوئی ہے جھروکے میں (جیسے اپنے آپ) نہ جانے دن بھر کھڑکی میں کھڑی کیا مڑ مڑ تکا کرتی ہے؟

بتولن (لمبا سانس لیتی ہے) کہا کرتے ہیں ماں کسی کی نہ مرے پر ممّو کو دیکھ کر میں دعا کیا کرتی ہوں ——— اللہ، باپ کسی کا فوت نہ ہو۔

خیرن۔ ساجد میاں تو آنکھوں پر بٹھائے رکھتے تھے اپنی اس بیٹی کو، ایک بار ذرا سی حرارت ہو گئی تھی۔ ساری رات سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ آنکھ تک نہ جھپکی تھی اُنہوں نے۔

بتولن۔ سنتی ہوں ممّو کی پہلی سالگرہ پر بڑی بھاری دعوت کی تھی اُنہوں نے۔ ارشد میاں کئی بار ذکر کیا کرتے ہیں اس دعوت کا۔

خیرن (سرگوشی میں) میاں ارشد میں اور ان میں بڑی گہری دوستی تھی۔ بیگم تو ارشد سے پردہ تک نہ کرتی تھیں۔ سنتے ہیں دونوں کو محبت تھی بیگم سے۔ لیکن ساجد مرحوم کامیاب ہو گئے۔

بتولن (سرگوشی میں) مگر سُنا ہے شادی کامیاب نہ تھی ان کی۔ بیگم پچھتاتی رہیں کہ اُنہوں نے ارشد میاں کو کیوں نہ چُنا۔

خیرن (اور بھی آہستہ) ارشد خوبصورت تھے لیکن (لمبا سانس لیکر) ساجد امیر۔

بتولن۔ (اسی آواز میں) اور بیگم نہ خود خوش رہ سکیں نہ اُنہیں خوش رکھ سکیں

خیرن۔ یہ تو اللہ ہی جانے۔ مگر کبھی شکن تک نہ دیکھی ساجد میاں کی پیشانی پر۔ اتنے

روپے کماتے تھے، اتنا کاروبار تھا پر مجال ہے جو نام کو بھی غرور ہو مزاج میں بھی نوکر تھے اس کے باوجود گھر کا معمولی سے معمولی کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے اور ممّو سے تو اتنا پیار کرتے کہ اپنے ہاتھ سے کھلاتے، پلاتے اور پہناتے جب دفتر سے آتے، کچھ نہ کچھ ضرور لے آتے۔ کندھے پر بٹھائے پھرا کرتے۔ پر اب بیچاری........

(گلا بھر آتا ہے)

بتولن۔ دل کے تو ارشد میاں بھی غنی ہیں اور غرور بھی اُن میں نام کو نہیں۔ مجال ہے جو کبھی بُرا لفظ کہتے ہوں۔ پھر یہی ہیں جو اتنی دیر بیگم کا نام جپتے رہے۔ نہیں سگائیوں کی کیا کمی تھی۔ خالو بہتیرا کہتے تھے نصرت کے لئے۔ لیکن ایک بار جو نہ کی تو ہاں نہیں کی۔ دو سال تک خالہ ان کی راہ دیکھتی رہیں۔ آخر بادل ناخواستہ بیاہ دی لڑکی ماجد کے ساتھ۔ یوں ممّو سے بھی....

خیرن (سرگوشی میں) ساجد میاں جانتے تھے دونوں کی دوستی کو۔ لیکن مجال ہے جو اُنہوں نے کبھی آنکھ میلی کی ہو۔ آہستہ آہستہ بیگم نے اپنی دلچسپی کم کر دی اُن میں وہ بیچارے صبح آٹھ بجے جاتے تو رات پڑے واپس گھر آتے۔ بیگم اوّل تو ہوا خوری کے لئے نکل جاتیں یا پھر سینما دیکھنے چلی جاتیں اور کہیں خدا ناخواستہ گھر بھی ہوتیں تو ہمیشہ مُنہ پھُلائے بیٹھی رہتیں۔ اس کے باوجود ساجد مرحوم ہنستے رہتے۔ اپنے سلوک میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیتے۔ نگوڑا کام بھی بیگم کو ہو جاتا تو ڈاکٹروں کے پیچھے مارے مارے پھرتے۔

بتولن۔ میں کہتی ہوں ساجد بُرا نہ مانتے اُن کی غیر حاضری کا۔

خیرن۔ وُہ نہ ہوتیں تو میمونہ سے دِل بہلاتے (گلا بھر آتا ہے) وہی بچی جسے ابا آنکھ کی پتلی بنائے رکھتے تھے اب۔۔۔۔۔

(آمنہ فرید کو اُٹھائے ہوئے داخل ہوتی ہے)

آمنہ۔ لے میں ابھی دیتی ہوں اپنے بیٹے کو آم۔ بتولن کہاں ہیں وُہ آم۔ ایک کاٹ کر ذرا فرید کو دو (اسے گلے سے لگا کر جھلاتے ہوئے) میرے بیٹے کو سُرلی بڑے پسند ہیں

(آموں کا نام سُنکر میمونہ مڑتی ہے اور آہستہ آہستہ کمرے میں آتی ہے)

آمنہ۔ اور دیکھ خیرن ممّو کو دو قاشوں سے زیادہ نہ دینا۔ پھوڑے نکل آتے ہیں اسے خون خراب ہے اس کا (نفرت سے) اس کے ابا کو بھی نکل آتے تھے پھوڑے۔ کھانا دیتے وقت۔۔۔۔۔۔

خیرن۔ کھایا ہی کب ہے کھانا بیٹی نے۔ لا کے رکھا تھا پر ایک دو لقمے بڑی مشکل سے زہر مار کئے۔

آمنہ۔ کھانا نہیں کھایا اس نے۔ میرے کمرے میں بھیج دے اس کا کھانا۔ نخرے تو دیکھ چڑیل کے (بتولن لوٹیا چھوڑ کر باورچی خانے میں جانے کو تیار ہوتی ہے) اور دیکھنا بتولن، فرید کو آم دے کر میرے سینڈل کو ذرا برش کر دینا، جانا ہے ابھی مجھے میٹنگ دیکھنے (میمونہ سے) چل ممّو۔

خیرن (بتولن سے) بیگم لے گئی ہیں ممّو کو، بتول بی کہ شور مچائے گی آموں کو دیکھ کر۔ ہائے میرے اللہ اپنی اولاد سے۔۔۔۔۔۔

آمنہ (اندر سے) خیرن بی، یہ ممّو کیا کہتی رہی ہے آج۔ صبح بدلا تھا فراک اس کا کہ چیکٹ کر دیا۔ اسے کبھی تمیز نہ آئے گی (ممّو کو کان سے پکڑے آتی ہے۔ بتولن

باورچی خانے میں چلی جاتی ہے) کیا مٹی میں کھیلتی رہی ہے دن بھر بالکل اپنے ابا پر ہے۔ نہ جسم کا ہوش نہ کپڑے کا (رک کر) اور دیکھ یہ فرید کا سوٹ بھی بدل دیجو

خیرن۔ صبح تو بدلا تھا

آمنہ۔ میلا معلوم ہوتا ہے۔ ماجد بھی شاید وہاں آئیں اور میں نہیں چاہتی کہ ان کے سامنے فرید کسی بھک منگے کا لڑکا دکھائی دے تم تیار کر دو اسے جلدی

(میمونہ سے) چل ممّو۔

(اسے لے جاتی ہے)

خیرن (لمبی سانس کھینچتی ہے) ہے میرے اللہ

تبولن (آم لاتے ہوئے فرید کے سامنے رکھ کر) لے یہ آم کھا۔ کھالے جلدی، پھر سینما جانا ہوگا۔

فرید۔ میں نہیں کھاتا

تبولن۔ کیوں بھلا، دیکھو تو کیسے میٹھے ہیں آم۔ تیرے لئے خریدے ہیں نمائش سے۔

فرید۔ اُوں۔ اُوں۔

تبولن۔ آخر کیوں

فرید۔ شیما بھی کھائے گی۔

تبولن۔ شیما چڑیل (خیرن سے) خیرن بی، ذرا دیجو آواز اسے۔

خیرن (کمرے کے دروازے پر جاکر) شیما . . . . شیما . . . .

(شیما اسی طرح شرماتی لجاتی داخل ہوتی ہے)

فرید۔ شیما، آؤ، آم کھائیں۔

آمنہ (اندر سے) خیرن لے آ، ممو کے لئے کھانا جلدی اور دیکھ آم دو قاشوں سے زیادہ نہ رکھنا۔ کہنا تو مانتی نہیں میرا چڑیل۔ گندی رہتی ہے۔ اب رہی گندی تو کچھ بھی نہ دوں گی۔ ماجد آجائیں اگر۔ . . .

(خیرن باورچی خانے میں جاتی ہے)

بتولن۔ شیما تجھے بڑی اچھی لگتی ہے نا فرید اور ممو۔

فرید (آم کھاتا ہوا) وہ تو خیرن کی بیٹی ہے

بتولن۔ خیرن کی بیٹی (ہنستی ہے) اور شیما۔

فرید۔ وہ امی کی بیٹی ہے (اسے بغل میں لیتا ہوا) تو میری بہن ہے نا شیما۔ ممو سے کٹی کریں گے ہم۔ کیوں نا۔

(خیرن طشتری میں کھانا لئے اندر جاتی ہے)

شیما۔ ممو سے کٹی!

(دونوں قہقہہ لگاتے ہیں ـــــ سادہ لوح ناداں قہقہہ)

خیرن (واپس آتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں) یہ بیگم، ماجد کا کیا ذکر کرتی رہتی ہیں ماجد یہ کہتے ہیں، ماجد یہ کرتے ہیں، ماجد یہ نہ کہیں، ماجد وہ نہ خیال کریں بس آٹھوں پہر ماجد کے گن گایا کرتی ہیں۔

بتولن (ڈرائینگ روم سے سینڈل لاتے ہوئے) نصرت سے پوچھ کے دیکھو ان کے گن بیچاری آدھی بھی نہیں رہی رو رو کے۔ ارشد میاں . . . .

خیرن۔ ارشد میاں بھی نہیں رو کتے۔

بتولن (سینڈل لے کر انہیں برش کرتے ہوئے) وہ خود اداس سے رہتے

ہیں۔ مجھے تو رحم آتا ہے ان کو دیکھ کر۔ جیسے ان میں اپنی کوئی آرزو ہی نہیں۔ بن پتوار کی کشتی کی طرح ڈولتے رہتے ہیں۔ نہ وہ ہنسی نہ خوشی۔ گھٹے گھٹے، دبے دبے۔ نصرت سے......

خیرن۔ نصرت سے تو......

بتولن۔ کر لیتے شادی تو سکھی رہتے۔ اتنی خوبصورت تو وہ نہیں خیرن بی۔ لیکن صبر کی پتلی ہے۔ مجال ہے جو دل کے جذبات کو چہرے پر ہویدا ہونے دے۔ گھٹ گھٹ کے رہ گئی پر ارشد میاں سے کبھی دل کا حال نہ کہا۔ مرتی مر جائے پر اُف نہ......

خیرن۔ نصرت تو......

بتولن۔ جب بھی کبھی جاتی ہوں مسکرا کر ملتی ہے۔ ارشد میاں کا حال پوچھتی ہے مگر اس کی وہ مایوس مسکراہٹ (لمبی سانس لیتی ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے دل میں اُترتی جا رہی ہے۔ میرے تو کچوکے لگتے ہیں خیرن بی۔

خیرن۔ لیکن ماجد

بتولن۔ ماجد کیا کر سکتے ہیں۔ دل تو ان کا کہیں اور تھا۔ بیگم......

خیرن۔ تب تو بات بھی نہ کرتی تھیں بیگم۔ ماجد سو بار بہلانے سے آ کر بیٹھتے۔ اپنی ان بھابی کے اشارے پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے۔ ان کی ہر فرمائش کو پورا کرنے کے لئے بےچین پھرا کرتے۔ آدھی آمدنی تو ان بھابی کے لئے تحفے لانے میں اُٹھ جاتی تھی۔ پر اس وقت تو بھابی منہ بھی نہ لگاتی تھیں۔ اُنہیں......

بتولن۔ اس وقت دیور کو کون پوچھتا۔ ارشد جو چڑھے ہوئے ہونگے نظر میں۔

خیرن۔ اور کیا میمونہ سے کہا کرتیں تو ارشد چچا کی بیٹی ہے۔ ویسی ہی ہیں عادتیں

تمہاری۔ اور یہ کہہ کر بھولی دسما تیں۔

بتولن (طنز سے) اور اب فرید ماجد کا بیٹا بن گیا ہے۔ اسے ماجد چچا کی عادتیں سکھائی جا رہی ہیں۔

(آمنہ داخل ہوتی ہے۔ بلاؤز اگرچہ وہی ہے۔ لیکن ساڑھی بدل لی گئی ہے بال پھر سے بنائے گئے ہیں چہرے پر غازے کا ہلکا سا غبار ہے اور ہونٹوں پر سُرخی کی تازہ لکیر)

آمنہ۔ کر دیا بُرش سینڈلوں کو۔

بتولن۔ جی بیگم۔ یہ لیجئے۔

آمنہ (سینڈل پہنتے ہوتے) اور بتولن اس فرید کو جلدی تیار کر دو۔ ہاتھ مُنہ اس کے دھو دو اور سوٹ بدل دو (بتولن سوٹ بدلنے کے خیال سے مُڑتی ہے) نہیں اب سوٹ رہنے دو۔ بس اس کے ہاتھ مُنہ دھلوا دو (بتولن فرید کو باورچی خانے میں لے جاتی ہے) اور دیکھو تم میرے ساتھ چلنا۔ اگر چل گیا فرید تو سارے کھیل کا لطف کرکرا ہو جائیگا اور خیرن بی تم میمونہ کا خیال رکھنا۔

خیرن۔ اسے بھی ساتھ . . . . .

آمنہ۔ کیا ابھی سے بگاڑ دوں اسے۔ ابّا نے پہلے ہی اس کی عادتیں کیا کم بگاڑ رکھی ہیں

خیرن۔ (لوبیا کترتے ہوئے) آپ بات بات میں ان کا نام ناحق . . . .

آمنہ۔ خیرن . . . .

خیرن۔ میں تو چپ رہنے کی بڑی کوشش کرتی ہوں لیکن جب آپ ہر بات میں اُنکا نام . . . .

آمنہ۔ خیرن . . . .

خیرن۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں سُنا جاتا جو میری گود میں پل کر جوان ہوا، جسے بچپن میں
اپنا دودھ تک پلایا جو اتنا نیک اور . . . . .

آمنہ۔ خیرن . . . . .

خیرن۔ اور پھر اسکی یہ بچّی صحرا میں بھٹکنے والی ننھی سی جان کی طرح اس گھر میں . . . . .
(بتولن فریدہ کو تیار کر کے لے آتی ہے۔ تولئے سے اُس کا ہاتھ مُنہ پونچھ کر
اس کے بالوں کو ہاتھ سے سنوارتی ہے)

آمنہ۔ خیرن میں دیکھتی ہوں تم میمونہ کی عادتیں بگاڑ رہی ہو۔ میں نے تو تمہارے بڑھاپے کا
خیال کر کے تمہیں چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا لیکن تمہیں دوسرا گھر دیکھنا پڑے گا۔
(بتولن سے) فریدہ کو لے جا کر موٹر میں بٹھاؤ، میں ابھی آئی۔

بتولن (تولیہ کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے) چلو فریدہ میاں۔
(دونوں جاتے ہیں)

آمنہ۔ یہاں میں رہ کر مگر مجھ سے بیر اچھا نہیں خیرن بی۔ اپنا بھلا بُرا سوچ لو۔ میمونہ تمہیں
ہی عزیز نہیں، میری بھی بچّی ہے۔
(چلی جاتی ہے)

خیرن (لمبی سانس لیکر) آہ، اگر وہ تمہاری بچّی ہوتی، وہ اپنے اپنا ابّا مرحوم کی بچّی ہے۔
اس کی موت کے بعد میری بچّی ہے۔
(آہستہ آہستہ ڈری ڈری سی میمونہ کمرے سے نکلتی ہے)

خیرن (آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگاتے ہوئے) آ میری یتیم بے آسرا بچی۔ اپنی اس بوڑھی
ماں کی طرح تو بھی بے سہارا اور محتاج ہے۔

(پیار سے اُسے چھاتی سے لگاتی ہے۔ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی ہے

—— باہر موٹر کے سٹارٹ ہونے کی آواز آتی ہے)

خیرن۔ تُو نے آم کھایا کیا (اسے چھاتی سے بھینچتے ہوئے) آ تو میں تمہیں دیتی ہوں آم

میمونہ۔ نہیں میں نہیں کھانی آم۔

خیرن۔ کیوں۔

میمونہ۔ آم کھانے سے پھوڑے نکلتے ہیں۔

خیرن (اسے پھر چھاتی سے لگاتی ہوئی) میری بچّی کو تو آم کھانے سے پھوڑے نکلیں اور اس پاجی کو ان سے آرام آئے۔ جس کا جسم پھوڑوں سے کوڑھیوں کی طرح اٹا رہتا ہے۔ لے تو میں تمہیں لاکر دیتی ہوں آم۔ دیکھوں تو کس طرح نکلتے ہیں تمہیں پھوڑے۔

(باورچی خانے سے آم لاکر اسے دیتی ہے)

—— لے تو کھا میری بیٹی۔

میمونہ۔ نہ

خیرن۔ آخر کیوں

میمونہ۔ امّی ماریں گی

خیرن۔ کون تیری امّی۔ تیری امّی تو میں ہوں لے کھا۔

(قاش اسے دیتی ہے۔ ارشد آتا ہے)

ارشد (افسردہ ہنسی کے ساتھ) اپنے اس بیٹے کو بھی تو آم کھلاؤ خیرن بی۔

خیرن۔ اوہ ارشد میاں ہیں۔

(میمونہ ڈر کر اندر کمرے میں چلی جاتی ہے)

خیرن۔ لو بھاگ گئی میمونہ تمہیں دیکھکر (ذرا سا ہنستے ہوئے) صبح سے بیٹی نے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ بیگم آم لائی تھیں میں نے سوچا.....

ارشد (اسی مغموم ہنسی کیساتھ) تمہارے اس بیٹے نے بھی کچھ کھایا پیا نہیں۔

خیرن۔ کیا کہتے ہو میاں۔ تم تو دعوت پر گئے ہوئے تھے۔

ارشد۔ دعوت (ہنستا ہے) وُہ تو آمنہ کی تھی۔ میں تو یونہی ضمیمے کے طور پر ساتھ چلا گیا تھا۔

خیرن۔ کیسی باتیں کر رہے ہو؟

ارشد (ہنستا ہے) تم نہ سمجھو گی۔

خیرن۔ بیگم تو کہتی تھیں آپ سینما ہاؤس میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ وُہ تو ابھی گئی ہیں

ارشد۔ مَیں نے اس کی کار کو جاتے دیکھا تھا۔ لیکن وہاں ماجد ہو گا۔ میں نے اُسے ٹیلیفون کر دیا تھا۔

خیرن۔ مالک آپ کیا کر رہے ہیں۔

ارشد۔ ماجد آمنہ سے محبت کرتا ہے اور وُہ بھی اب اس سے نفرت نہیں کرتی۔

خیرن۔ سرکار آپ اور بیگم میں.....

ارشد۔ محبت تھی یہی کہنا چاہتی ہو نا تم۔ لیکن اس محبت کے درمیان ساجد آ گیا۔ مَیں جوانی کی اس بے لوث سادہ لوح محبّت کے فریب میں مبتلا تھا۔ تصوّرات کے محل تعمیر کرتا رہا۔ میں آمنہ کو ہمیشہ اس کے پہلے روپ میں دیکھتا رہا۔ مجھے کیا معلوم کہ ساجد کو اپنی محبّت سے محروم رکھنے والی آمنہ اُس کی دولت کو دل دے بیٹھی ہے۔ ساجد کو اُس نے چھوڑ دیا۔ اُس کی دولت کو نہ چھوڑ سکی (جیسے اپنے آپ) وُہ ارشد کو — غریب لاابالی اور آزاد منش ارشد کو — مہذب سوسائٹی

کے ادب و آداب سکھا کر پالتو کتے کی طرح ساتھ ساتھ لئے پھرنا چاہتی ہے (ہنستا ہے) وُہ اسے چوم لے گی اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لے گی۔ لیکن اسکی نظروں میں اس کی وقعت پالتو کتے سے زیادہ نہ ہو گی۔

خیرن۔ (بھرے گلے سے) سرکار۔

ارشد۔ پہلے اگر وُہ مجھ سے شادی کرتی تو میری اس بے پروائی اور لااُبالی پن سے نفرت نہ کرتی۔ وُہ اسے پیار کرتی۔ میری ہستی میں اپنی ہستی مدغم کر دیتی لیکن اب اُس نے اپنی الگ ہستی بنالی ہے۔ امارت کے بناوٹی اور بے حس ادب و آداب سے ملبوس ایک مصنوعی ہستی ——— میرے لااُبالی پن سے اب وُہ اُکتا جاتی ہے۔ وُہ میری اصلاح کرنا چاہتی ہے۔ پالتو کتے کی طرح مجھے ساتھ ساتھ لئے پھرنا چاہتی ہے اسے شائستہ، مہذب، امیر ماجد مبارک رہے۔ وُہ فرید کو شوق سے ماجد چچا جیسا بناتے۔ ارشد اپنی الگ دُنیا بسا لے گا۔

خیرن۔ لیکن میمونہ (گلا بھر آتا ہے) میری غریب، معصوم بچی! وُہ تو گھٹ کر مر جائیگی اس فضا میں مالک۔

ارشد۔ میمونہ . . . . .

خیرن۔ میں تو ابھی تم سے کہہ رہی تھی کہ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں دیکھا جاتا۔ میری عزیز بچی، اس ماحول میں گھٹی جا رہی ہے۔

ارشد۔ میں خود گھٹا جا رہا ہوں۔

خیرن۔ میں اس کا یہ حال نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے چھٹی دو۔

ارشد۔ چھٹی (ہنستا ہے) میں خود چھٹی لے رہا ہوں۔

خیرن۔ اماں اسے اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتی۔ تمہارے پاس وہ آتی نہیں۔ اداس اداس کھوئی کھوئی سی پھرتی رہتی ہے ــــ کبھی اس جھروکے میں کبھی اس جھروکے میں کھڑی نہ جانے کیا سوچتی رہتی ہے۔ ان دو برسوں میں آدھی بھی تو نہیں رہی۔

(میمونہ دوسرے کمرے سے جھانکتی ہے۔ پھر کترا کر باہر نکل جانا چاہتی ہے)

ــــ یہ دیکھو پھر کنی کترا کر باہر نکل چلی ہے۔

ارشد۔ (اسے پکڑ کر انتہائی پیار سے) ممو ادھر تو آ بیٹی۔ تو مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہے (اسے گود میں لے کر) تو میرے سامنے سے چوری چوری کیوں نکل جاتی ہے مجھ سے کنی کیوں کتراتی ہے (اسے چومتا ہے) میں تیرا ابا ہوں (اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اسے گلے سے لگاتا ہے) بتا تو کس کی بیٹی ہے میری ممو بیگم!

میمونہ (چپ)

ارشد (اسے پیار کرتا ہوا) کس کی بیٹی ہے میری اچھی ممو۔

میمونہ۔ میں خیرن بی کی بیٹی ہوں۔

ارشد۔ (اسے آغوش میں بھینچتا ہوا) تو میری بیٹی ہے خیرن کی نہیں، ساجد کی نہیں۔ آمنہ کی بھی نہیں۔ تو اپنے ابی کی بیٹی ہے (لمبا سانس لیتا ہے) اپنے ابی کی لاابالی، آزاد بے پروا دلوں کی بیٹی (پھر لمبا سانس لیتا ہے) اب تو بھی اس کی طرح گھٹ کر رہ گئی ہے لیکن میں اپنی بیٹی کو ذرا تکلیف نہ ہونے دوں گا (اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور میمونہ کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر آغوش سے لگا لیتا ہے) اپنے ابی کی بیٹی ہے نا میری اچھی ممو۔

(میمونہ پہلے جھجکتی ہے۔ پھر اپنے ننھے ننھے ہاتھ ارشد کی گردن میں حمائل کر دیتی ہے)

مقناطیس

افراد

گوپا	سرتا	بابا
گوتم	یکے والا	دولو

مقام :- وسط پنجاب کا ایک گاؤں

وقت :- شام

(سشن جج کے عہدے سے ریٹائر ہو کر گوپا کے بابا نے اپنے گاؤں کے باہر اپنے آموں کے باغ میں برلبِ سڑک ایک چھوٹا سا بنگلہ تعمیر کر لیا ہے۔ زندگی کا سورج غروب ہونے کو ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میٹھی میٹھی ہوا کی تھپکیوں سے ہلکے پھلکے بادلوں کی چادر اوڑھ کر خاموشی سے سو جائے۔ گوپا کے بابا کو شور و شغب پسند نہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ ایک بار بھی شہر نہیں گئے ـــــــ سڑک پر تانگے چلتے ہیں۔ اس سے پرے موٹریں اور گاڑیاں اور ضرورت کی سب چیزیں وہیں میسر ہو جاتی ہیں۔ لیکن گوپا جو بی۔اے کا امتحان دینے کے بعد اپنی رخصت کے دن گذارنے یہاں آئی ہے (کم سے کم اس نے اپنی سہیلیوں کو یہی بتایا ہے۔ اگرچہ اپنے رشتے داروں کی نظروں میں وہ اپنے بابا کی تیمارداری کر رہی ہے) چند ہی دنوں میں گھبرا گئی ہے۔

پردہ اٹھتے وقت ہم دونوں کو ڈرائینگ روم میں بیٹھے دیکھتے ہیں۔ یہ ڈرائنگ روم

بھی شہری اور دیہاتی مذاق کے ملاپ کا نمونہ ہے۔ اس میں کوچ بھی ہیں، میز اور کرسیاں بھی۔ لیکن ساتھ ہی بائیں دیوار کے ساتھ ایک تخت پوش بھی بچھا ہے۔ جس پر گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے۔

سامنے کی دیوار میں کھڑکی، انگیٹھی اور ایک دروازہ ہے ——— کھڑکی دائیں طرف کو ہے جس میں سے آم کے پیڑوں کے تنے اور گھنے سائے پتوں کی ہریالی کے امتزاج سے آنکھوں کو عجیب سی طراوت بخشتے ہیں۔ انگیٹھی پر بہت سا سامان پڑا ہے۔ جس میں مٹی کے کھلونے، چینی کے گلدان اور دوسری چیزوں کے علاوہ ایک تمباکو کا برتن اور سگریٹ کی ڈبیا بھی پڑی ہے۔ دروازہ ایک دوسرے کمرے کو جاتا ہے جو اس وقت گوپا کے سونے اور پڑھنے کا کام دیتا ہے۔

دائیں دیوار میں ایک کھڑکی اور ایک دروازہ ہے۔ کھڑکی میں سے اٹاری سے چوگاواں کو جانے والی سڑک دکھائی دیتی ہے اور دروازہ باہر کو کھلتا ہے۔

بائیں دیوار کے پرلے کونے میں ایک دروازہ ہے جو باہر آنگن کو جاتا ہے۔

بابا اس وقت سامنی دیوار کی کھڑکی کے پاس مونڈھے پر بیٹھے مزے سے حقہ پی رہے ہیں گوپا تخت پوش پر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے کتاب پڑھ رہی ہے۔ پاؤں اس کے اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں اور وہ انہیں دھیرے دھیرے ہلا رہی ہے۔

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحہ تک بابا کے حقے کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی رہتی ہے۔ سامنے کھڑکی میں آموں کے سائے آہستہ آہستہ گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ روشنی کی کرنیں ماند پڑنے لگتی ہیں اور عقب میں درختوں کی سائیں سائیں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بابا چونک کر اٹھتے ہیں)

بابا۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں دائیں طرف کی کھڑکی میں دیکھتے ہوئے) گوپا ... گوپا!

گوپا۔ (اسی طرح بیٹھے بیٹھے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر) کیا بات ہے بابا؟

بابا۔ (چڑ کر) کیا بات ہے بابا۔ دیکھتی نہیں ہو سامنے آسمان گرد آلود ہو گیا ہے۔ پکھیرو گھونسلے چھوڑ کر آسمان میں پریشانی سے گھوم رہے ہیں۔

(عقب میں درختوں کی شاں شاں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑ کھڑکھڑاتے ہیں اور کمرے میں ہلکا سا غبار چھا جاتا ہے)

ــــ باغ کے درخت چیخ اٹھے ہیں۔ کواڑ کھڑکھڑانے لگے ہیں ــــ کیا بات ہے بابا۔

ــــ کالی آندھی آ رہی ہے کالی .....

(گوپا ہاتھ میں کتاب لئے ہوئے اٹھ کر دروازے اور کھڑکیوں کے کواڑ لگا دیتی ہے)

ــــ یہ روشندان بھی بند کر دو۔

(گوپا بڑبڑاتی ہوئی روشندان کی رسی کھینچتی ہے)

گوپا۔ کمرے میں کتنی گرد بکھر گئی۔ میرا تو سانس جیسے گھٹا جا رہا ہے۔

(کھڑکی کی طرف بڑھتی ہے)

بابا۔ کچھ لمحے خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اس کتاب کو چھوڑ دو، اندھی ہو جاؤ گی۔ آندھی کا غصہ فرو ہو لینے دو۔ پھر کھڑکی چھوڑ دروازہ کھول لینا۔ نہیں تو پندرہ دن لگاتار جھاڑنے بہارنے سے بھی کمرہ صاف نہ ہوگا۔

(باہر طوفان کا زور بڑھ جاتا ہے)

گوپا (کرسی میں دھنستی ہوئی) یہ کمبخت کیسا موسم ہے۔ سارا سارا دن آگ برستی ہے اور پھر گرد چھانے لگتی ہے تو سورج بھی چاند کی پیلی سی ٹکیا معلوم ہوتا ہے ــــ صبح

گرد، شام گرد! حلق اور نتھنے سوکھ سوکھ جاتے ہیں۔ میں تو عاجز آ گئی ان آندھیوں اور بگولوں سے!

(کھڑکی کے شیشے پر کچھ پانی کے چھینٹے پڑتے ہیں)

بابا۔ بس اب برسات آ گئی، دھرتی کا یہ خمار بیٹھ جائے گا

گوپا۔ (اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتی ہوئی) خاک آ گئی برسات! ان چار چھینٹوں سے کیا ہوتا ہے؟

بابا۔ نہیں یہ برس کے جائیگا (مسترت سے) اور یہ وسیع ویرانے دھان، گنّا اور مکئی کی ہریالی سے لہلہا اٹھیں گے۔

گوپا (اچانک چونک کر) بابا۔ بابا

بابا (اس کی طرف جاتے ہوئے) کیا بات ہے؟

گوپا۔ (ہنستی ہے) دیکھئے نا (پھر ہنستی ہے) دیکھئے نا اس تانگے کو (دردسے ہنستی ہے) کسی غریب کی جھونپڑی کے چھپر کی طرح اس کی چھت اڑ گئی ہے اور وہ گھوڑا (ہنستی ہے) کمبخت کسی ضدی اندھے کی طرح بارش اور طوفان کو چیرتا چلا آ رہا ہے (اچانک سنجیدہ ہو کر) ارے اس میں تو کوئی لڑکی ہے

بابا۔ (اس کے کندھے کے اوپر سے دیکھتا ہوا) بالکل اکیلی! نہ جانے کس مصیبت کی ماری تن تنہا اس طوفان میں سفر کر رہی ہے۔ . . . دروازہ کھول دو بیٹی۔ اس کی پریشان نگاہیں پناہ کی تلاش کر رہی ہیں۔

گوپا (دروازہ کھول کر اسے آواز دیتی ہے) ادھر آ جاؤ بہن! ادھر چلی آؤ!!

(گیلی ہونے کے باعث بدن سے چپٹی ہوئی ساڑی پہنے بھیگے بکھرے بال لئے ایک ہاتھ میں بیگ تھامے سرتا داخل ہوتی ہے)

سترنا۔ اوہ! (سکھ کا لمبا سانس لیتی ہے) میں بیحد مشکور ہوں (کانپتی اور قدرے ہنستی ہے) مجھے سردی سی لگنے لگی ہے۔

بابا۔ گوپا تم انہیں بٹھاؤ۔ میں اتنے میں دولو سے چائے بنانے کو کہتا ہوں (سترنا سے) بیٹھو بیٹی اسے اپنا گھر سمجھو۔

(آنگن کے دروازے سے چلے جاتے ہیں)

گوپا۔ (سترنا سے) آئیے آئیے چلے آئیے یہ کپڑے بدل ڈالئے ہچکیٹ ہو رہے ہیں.... جوتے . . . . (ہنستی ہے) کوئی بات نہیں یہ لے آئیے، پائدان پر صاف کیجئے

سترنا (پائدان پر جوتے پونچھتی ہوئی) میں بے حد ممنون ہوں۔

گوپا۔ ادھر کمرے میں آجائیے اور کپڑے بدل ڈالئے، سردی وردی ہی لگ جاتی ہے۔

سترنا۔ (گوپا کے ساتھ اندر کمرے میں جاتے ہوئے) کچھ بارش ہو رہی ہے جیسے آسمان کے کسی نامعلوم بیرج کے بندھ ٹوٹ گئے ہیں۔ میں تو آنکھ جھپکتے میں شرابور ہو گئی۔

(اندر کمرے میں چلی جاتی ہے —— گوپا باہر رہتی ہے)

گوپا (نوکر کو آواز دیتی ہے) دولو۔ دولو

دولو (باہر سے) جی بی بی جی!

گوپا۔ ذرا تولیا لانا جلدی (سترنا سے) کپڑے آپ کونسے پہنیں گی۔ ساڑھی لاؤں یا شلوار، جو کہیں وہی لاؤں۔

سترنا (اندر سے) شکریہ۔ کپڑے میرے بیگ میں ہیں (ہنستی ہے)

گوپا۔ اس طوفان میں آپ کہاں جا رہی تھیں؟

سترنا۔ پریت نگر۔

گوپا (حیرت سے) پریت نگر! لیکن وہ تو یہاں سے بھی سات میل آگے ہے
سرتا (ہنس کر) اب تو صرف سات میل رہ گیا ہے، لیکن میں تو منٹگمری سے آئی ہوں۔
گوپا (اور بھی چونک کر) منٹگمری سے، تن تنہا!
سرتا۔ تنہائی سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔
گوپا۔ اور اس ویران سڑک پر آپ اکیلی سفر کر رہی ہیں۔
سرتا (ہنس کر) میں نے اس سے کہیں زیادہ ویران سڑکوں پر اکیلے سفر کیا ہے۔
(یکّے والا دروازے پر دستک دیتا ہے)

یکے والا۔ بابا جی، بابا جی!
گوپا۔ (دروازہ کھولکر) ارے کلو تم ہو، تمہارے یکّے پر آئی ہیں یہ، کہو کیا بات ہے؟
یکے والا۔ بابا جی! . . . . بابا جی کہاں ہیں؟
گوپا۔ کہو کہو کیا بات ہے؟
یکے والا۔ جی اگر کوئی بیڑی ملجاتی تو . . . .
گوپا۔ بیڑی (ہنستی ہے) بیڑی تو یہاں کوئی نہیں پیتا۔
یکے والا۔ تو پھر سگریٹ ہی ملجائے۔ میری جیب میں تو (جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے ہوئے) سب کچھ پانی ہو گیا ہے۔
گوپا۔ سگریٹ . . . . میں دیکھتی ہوں . . . . ابھی پرسوں ایک مہمان آئے تھے ڈبیا یہیں بھول گئے ہیں اور تو کوئی پیتا نہیں یہاں۔
(انگیٹھی پر ڈھونڈھ کر سگریٹ کی ڈبیا لاتی ہے اور ایک سگریٹ نکال کر یکّے والے کو دیتی ہے)

گوپا۔ یہ تو پیو، بابا تو ہمارے حقہ پیتے ہیں۔ سگریٹ سے اُنہیں نفرت ہے۔
یکے والا۔ جی دیا سلائی۔
گوپا (نوکر کو آواز دیتی ہے) دُولو۔ دُولو!
دولو (آنگن کے دروازے میں سے) جی ہیں یہ رہا۔ یہ لیجئے تولیہ
گوپا (اس کی طرف جاتے ہوئے) اب لایا ہے تولیہ کمبخت، لا دے اور جا بھاگ کر دیا سلائی کی ڈبیا لے آ (تولیہ کمرے کے اندر پھینکتی ہے) یہ تولیہ لو بہن، بدن پونچھ ڈالو (یکے والے کے پاس جاکر) ابھی آتی ہے دیا سلائی، تم ذرا اندر آ جاؤ۔ اس طرح بارش کی بوچھاڑ آ رہی ہے اور دروازہ بند کر دو۔

(یکے والا اندر آ کر دروازہ بند کر دیتا ہے)

——تم کس طرح چل پڑے اس وقت، رات کہاں رہو گے۔
یکے والا۔ جی میں نے تو انکار کیا تھا۔ لیکن یہ آنے کے لئے مُصر تھیں۔ کہنے لگیں میں واپس نہیں جا سکتی۔ سوا کی جگہ دو روپے دے دوں گی۔ لے چل۔ میں نے کہا:۔ "بی بی جی دس میل ہے۔" کہنے لگیں۔ "کوئی پروا نہیں، تو لے چل میں اسی گاڑی منٹگمری سے آئی ہوں۔ واپس اب نہیں جا سکتی۔" میں نے سوچا——چلو رات پریت نگر ہی رہ لیں گے۔ سواریاں تو صبح ادھر سے مل ہی جاتی ہیں۔ پھر اٹاری کے پہلوان نے بھی کہا۔ "جاؤ چھوڑ آؤ جاکر یہ کچھ اور انعام دے دیں گے۔" اور پہلوان کی بات آپ جانتی ہیں ہم کیسے ٹال سکتے ہیں، اڈے کا مالک جو ٹھہرا۔
گوپا۔ لیکن شام کے وقت تنہا، انہوں نے حوصلہ کیسے کر لیا۔
یکے والا۔ جی ان کے حوصلے کی نہ پوچھئے۔ بڑا دل ہے ان کا۔ ایک شام رینالہ سے

اوکاڑہ تک گیارہ میل اکیلی تانگے پر چلی گئی تھیں۔

گوپا۔ گیارہ میل!

یکے والا۔ جی بتا رہی تھیں کہ رینالہ کسی کام سے گئی تھیں۔ وہاں سے چلتے وقت دیر ہو گئی دیر، گاڑی کا وقت نکل گیا اور لاری کوئی ملی نہیں۔ انہیں صبح سکول پہنچنا تھا۔ بس تانگہ لے کر چل دیں۔

دولو (آنگن کے دروازے سے دیا سلائی پھینکتا ہوا) یہ دیا سلائی بی بی جی۔

(گوپا دیا سلائی کی ڈبیہ اٹھا کر یکے والے کو دیتی ہے اور وہ سگریٹ سُلگاتا ہے)

یکے والا (ایک دو کش لگا کر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے) راستے میں ایک لاری ملی جو سامان سے بھری ہوئی تھی۔ بیدھڑک تانگے سے اُتر کر اُنہوں نے لاری روک لی۔ لاری میں سامان کے علاوہ ایک سپاہی اور دو دوسرے شخص بیٹھے تھے۔ کسی طرح کا خوف دل میں لائے بغیر یہ اس میں سوار ہو گئیں۔ نہ انہیں دیر لگنے سے ڈر لگا نہ اس سامان سے بھری لاری میں تنہا تین غیر مہذب آدمیوں کے ساتھ سفر کرنے سے —— شاید وہاں کے ڈپٹی کمشنر کی رشتے دار ہیں یہ۔

(زور سے ہوا کا جھونکا آتا ہے اور کواڑ کھل جاتے ہیں)

گوپا۔ تم کلو بر آمدے میں چلے جاؤ —— پچھلی طرف —— یہاں تو بارش آ رہی ہے۔

یکے والا۔ (جاتے جاتے مڑ کر) جی ایک سگریٹ اور دے دیجئے (مسکراتا ہے) آپ کے دادا تو حقہ پیتے ہیں۔

گوپا (ہنستے ہوئے) لے۔

(یکے والا چلا جاتا ہے۔ گوپا دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دیتی ہے۔ سرتا کپڑے
بدل کر باہر آتی ہے)

سرتا (ہنستے ہوئے) یہ شلوار قمیص میں رات کو پہنتی ہوں۔ زیادہ کپڑے میں ساتھ لائی
نہیں اور یہ بارش کمبخت ...... (ہنستی ہے) ایک ساڑی تو میں نے وہاں
پہننے کے لئے رکھ چھوڑی ہے۔

گوپا۔ آپ مجھ سے ......

سرتا۔ مہربانی! کام تو چل گیا۔ نائٹ سوٹ .....

گوپا۔ کوئی بات نہیں (ہنس کر) یہاں دیہات میں (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) بیٹھیئے
میں چائے کیلئے کہہ آؤں۔

(آنگن کے دروازے کی طرف جاتی ہے۔ سرتا میز پر باہیں پھیلا کر ان میں
سر رکھ دیتی ہے)

گوپا (نوکر کو آواز دیتے ہوئے) جلدی چائے لاؤ دولو (واپس آکر سرتا کو اس طرح میز
پر باہیں پھیلائے دیکھ کر) کیوں کیا بات ہے؟

سرتا۔ کچھ نہیں، تھک گئی ہوں، نیند سی آرہی ہے (اُٹھ کر انگڑائی لیتے ہوئے) یہ بارش
ابھی کم نہیں ہوئی۔

گوپا۔ موسلا دھار پڑ رہی ہے

سرتا (جیسے اپنے سے) اور مجھے آج ضرور وہاں پہنچنا ہے۔

گوپا (ذرا سا ہنس کر) ابھی یکّے والا کہہ رہا تھا کہ منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر آپ کے رشتے دار ہیں

سرتا۔ (ہنستے ہوئے) جب کہیں دیرانے میں مجھے تنہا سفر کرنا پڑتا ہے تو اس جگہ کے

افسر میرے رشتے دار بن جاتے ہیں۔

(دونوں قہقہہ لگاتی ہیں۔ نوکر چائے کی پیالیاں لاکر میز پر رکھتا ہے)

گوپا (ہنستے ہوئے) میں تمہارے حوصلے کی داد دیتی ہوں۔ میں ہوتی تو اٹاری سے مڑ جاتی۔

سرتا۔ کسی کام کو شروع کر کے مڑنا میں نے نہیں سیکھا۔

گوپا (پیالیوں میں چائے انڈیلتی ہوئی) وہاں آپ اطلاع ہی دے دیتیں۔ کوئی آپ کو لینے اٹاری آجاتا

سرتا۔ میں وہاں بغیر اطلاع کئے پہنچنا چاہتی ہوں۔

گوپا۔ چینی

سرتا۔ ڈیڑھ چمچہ

گوپا (چینی ڈالتے ہوئے) بھئی تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔

سرتا (اضطراری حرکت کے طور پر کرسی کا ایک چکر لگاتے ہوئے) سیدھی بات تو یہ ہے۔ میں انہیں سرپرائز وزٹ (SURPRISE VISIT) دینا چاہتی ہوں۔ انہیں تو خبر بھی نہیں۔ میں پہنچوں گی تو حیران رہ جائیں گے۔

گوپا۔ تم... معاف کیجئے، میں بھول جاتی ہوں۔ آپ کہنا۔

سرتا۔ (ہنستے ہوئے) آپ کی کوئی ضرورت نہیں۔

(دونوں ہنستی ہیں)

گوپا (پیالی کو اس کی طرف سرکاتے ہوئے) تم... ا... کن سے ملنے جا رہی ہو۔

سرتا (ہنس کر) تیم پوچھ کر کیا کرو گی۔

گوپا۔ کیا وہاں تمہارے بھائی ہیں، کوئی رشتے دار ہیں یا تمہارے... ے... ے...

سرتا (پھر کرسی پر بیٹھ کر چائے کا کپ ہاتھ میں لیکر) نہیں نہیں، ان میں سے کوئی بھی نہیں

گوپا۔ پھر

سرتا (چسکی لیتی ہے) تمہیں وہ بات بالکل عجیب معلوم ہوگی۔

(چائے پیتی ہے۔ لیکن چونکہ چینی ابھی تک ملی نہیں ہوتی۔ اس لئے پھر کھیلتی ہے)

گوپا (تجسّس سے) پھر بھی، پھر بھی.....

سرتا (چمچے سے کھانڈ ہلاتے ہوئے) وہاں ایک شاعر ہیں۔ مجھے ان سے محبت ہے

گوپا (چونک کر) شاعر..... محبت.....

(سرتا پیالی لئے لئے اُٹھ کر کمرے کا ایک چکر لگاتی ہے پھر کرسی پر کہنیاں ٹیک کر چائے پیتی ہے)

سرتا۔ ہاں مجھے اُن سے محبت ہے۔

(پیالی ختم کر کے میز پر رکھ دیتی ہے اور پوری انگڑائی لیتی ہے)

—— یہ کمبخت یکّے کی سواری..... میرا تو جوڑ جوڑ درد کرنے لگا ہے۔ یوں بھی کل رات جاگتی رہی ہوں۔

گوپا۔ کیوں۔

سرتا۔ نیند ہی نہیں آئی۔ ایکسائٹمینٹ (EXITEMENT) کے مارے اور پھر سفر، آنکھیں بند سی ہوتی جا رہی ہیں۔

گوپا (دوسری پیالی بناتے ہوئے) ایک کپ اور پیو طبیعت شگفتہ ہو جائے گی..... تو تمہیں اس سے محبت ہے۔

سرتا۔ (پیالی اُٹھاتے ہوئے) یا یوں کہو کہ انہیں مجھ سے محبت ہے۔ لیکن انہیں آج

میرے آنے کا گمان تک نہیں۔ ایک خط میں اُنہوں نے لکھا تھا ــــ کہیں دو چار دن کے لئے آجاؤ تو . . . . . .

گوپا۔ اور تم اُٹھ بھاگیں۔

سرتا۔ انہیں معلوم بھی نہیں . . . . .

گوپا۔ لیکن . . . . . .

سرتا۔ اُنہوں نے چھٹیوں میں آنے کو لکھا تھا۔ نہ جانے اُن کے خطوں کو پڑھ کر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ یہی چاہتی ہوں کہ اُڑ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں (پیالی ہاتھ میں لئے لئے جیسے کسی دوسری دُنیا میں پہنچ جاتی ہے) وہ بہت پریشان اور اُداس رہتے ہیں۔ ابھی کل ان کا خط ملا تھا (رومان بھرے لہجے میں) "تم حال پوچھتی ہو" اُنہوں نے لکھا تھا "بس زندگی کا چکر سا چل رہا ہے۔ گھومے جا رہا ہے۔ میری اُداسی یا بیکلی کیلئے یہ رُکے گا نہیں ــــ لیکن سرتا یہ عجیب بات ہے کہ میں اُسے ساکن پاتا ہوں ــــ بالکل اسی طرح جیسے یہ وسیع دھرتی گھوم رہی ہے اور ہمیں کچھ معلوم بھی نہیں ہوتا ــــ زندگی جیسے ایک اتھاہ ساگر ہے ــــ ٹھہرا اور رُکا ہوا ــــ اور میری اُداس اور خاموش گھڑیاں بے بس اور لاچار اس میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔" (جلدی جلدی چائے کے ایک دو گھونٹ پیتی ہے) سوچتی ہوں، جب میں وہاں اچانک جا پہنچوں گی اور انہیں معلوم ہوگا کہ میں منٹگمری سے اتنی دور، دریا اور ویرانے پار کرتی ہوئی ــــ بارش اور طوفان میں دس میل کا یہ لمبا، اُونچا، اُوبڑ کھابڑ راستہ ایک ٹوٹے سے یکے پر عبور کر کے آئی ہوں تو . . . . . تو . . . . .

(مسرت اور جوش سے کمرے میں ایک چکر لگاتی ہے)

سرتا (اچانک رُک کر اور کرسی پر کہنیاں ٹیک کر) اُن کی مایوس اور غمگین آنکھوں میں مسرت اور حیرت کی ہلکی سی لکیر چمک اُٹھے گی۔

(پیالی خالی کر کے میز پر رکھ دیتی ہے)

——— (انگڑائی لے کر) اوہ کہیں یہ کمبخت بارش اگر تھم جائے۔

گوپا۔ لیکن راستہ تو اب یکّے کے بس کا نہ رہا ہوگا۔ چوگاداں سے آگے تین میل بالکل کچے ہیں

سرتا۔ بارش ہلکی ہو جائے تو مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ یکّہ چوگاداں ہی میں چھوڑ کر میں یکّے والے کے ساتھ تین میل پیدل چلی جاؤں گی۔ لیکن آج پہنچوں گی ضرور (جیسے اپنے آپ سے) وُہ پریشان اور اُداس ہیں۔ ان کے دن خاموش سنسان اور اُداس ہیں تو کیا میں نہ جاؤں گی ان کا غم بٹانے اُن کی اُداسی دور کرنے۔

گوپا (ہنس کر) تم رومان پسند ہو۔

سرتا۔ یہی ایک بار اُنہوں نے کہا تھا۔

گوپا۔ آپ لوگ پہلے پہل کب ملے؟

سرتا (کمرے کا ایک چکّر لگاتی ہوئی) کبھی نہیں، میرا مطلب ہے کہ یہی بات اُنہوں نے بھی ایک دفعہ لکھی تھی۔ ورنہ وُہ تو مجھے پہچانتے تک نہیں ہماری واقفیت صرف خطوں تک محدود ہے۔

گوپا (اور بھی حیران ہو کر) پہچانتے تک نہیں تو پھر تم . . . .

سرتا۔ میں نے اُنہیں دیکھا ہے ——— ایک بار لاہور کے جلسے میں اُن کی نظم سُنی تھی۔ کتنا اچھا گاتے ہیں وُہ، کتنا سوز ہے اُن کی آواز میں۔ وُہ نظم اُنہوں نے اپنی مرنے والی بیوی کو مخاطب کر کے لکھی تھی (گھومتے گھومتے دائیں طرف کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی ہے اور

لحظہ بھر تک برستے ہوئے بادلوں کو چپ چاپ دیکھتی ہے۔ پھر پلٹ کر) میں اس وقت بی اے میں پڑھتی تھی۔ کئی دنوں تک میرے کانوں میں اُن کی آواز گونجتی رہی اور دماغ میں ان کے الفاظ چکر لگاتے رہے۔ پھر ایک دن مال روڈ پر میں نے اُنہیں دیکھا (سامنے جیسے کسی دوسری دُنیا میں دیکھتے ہوئے) بال بکھرے ہوئے تھے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ دھوپ کی تپش سے بے پروا، سر جھکائے آہستہ آہستہ پریشان اور غمگین فٹ پاتھ کے کنارے کنارے چلے آ رہے تھے ـــــ نہ جانے اس وقت اُن کا من بیتے دنوں کی ناقابلِ عبور چار دیواری کو پار کر کے کہاں کا کہاں پہنچ چکا تھا (جیسے اس دُنیا میں واپس آ جاتی ہے) اُنہیں اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی۔ اس کی موت نے اُن کی زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا تھا۔

گوپا (جیسے سب کچھ بوجھ گئی ہو) اور پھر تم نے اُنہیں خط لکھا۔

سرتا (آہستہ آہستہ کمرے میں چکر لگاتے ہوئے) نہیں، اس کے بعد تو میں نے بی ٹی کا امتحان دیا۔ ان کی اور نظمیں چھپیں۔ وہ سب میری ڈائری میں موجود ہے (اچانک رُک کر) تم نے شاید انہیں نہیں پڑھا، کتنا درد ہے ان نظموں میں، کتنا سوز ہے ان کے ایک ایک مصرعے میں ـــــ میں اور اسیما پڑھتے پڑھتے رو دیتی تھیں ـــــ گذرے بیتے مسرت بھرے دنوں کی ویران سمادھی پر ان کا دل خون کے آنسو بہاتا ہے ـــــ محبت کا کیسا بے پناہ طوفان چھپا ہوا ہے اس شخص کے دل میں، ہم سوچا کرتی تھیں اور اسیما تو . . . .

گوپا۔ بہن ہے تمہاری اسیما؟

سرتا۔ نہیں میری سہیلی ہے۔ بچپن سے ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھتی آئی ہیں۔ وہ سارا سارا دن

گایا کرتی تھی ان نظموں کو (پھر دھیمی آواز میں آہستہ آہستہ) بی ٹی کرنے کے بعد میں نوکر ہو کر اوکاڑے چلی گئی اور اسیما اپنی ماں کے پاس مری جا پہنچی۔ ہیڈ مسٹریس تھی اُس کی ماں وہیں۔ تب اوکاڑے کی گرم اور دم گھونٹ دینے والی تنہائیوں میں میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ وہ نظمیں مجھے کتنا آرام، کتنا سکون اور کتنی ٹھنڈک پہنچاتی تھیں۔ انہی دنوں میں نے خود ایک نظم لکھی۔

گوپا۔ اچھا تو تم خود بھی شاعر ہو۔

سرتا (جیسے کسی بھولے واقعہ کو یاد کرتے ہوئے) نہیں شاعر تو کیا ہوں۔ ان دنوں میں بیحد پریشان تھی۔ مجھے راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔ اسیما کے سلوک سے میرے دل میں آگ سی سلگی رہتی تھی —— تب اپنے دل اور دماغ کے بوجھ کو ہلکا کرنے کیلئے میں نے نظم لکھی تھی۔

گوپا۔ لیکن اسیما نے .....

سرتا۔ تم نہیں جانتیں اسیما نے میرے ساتھ کیسا بُرا سلوک کیا۔ مجھے اسیما سے بیحد محبت تھی۔ برسوں ہم ساتھ ساتھ پڑھیں، ساتھ ساتھ کھیلیں۔ ایک بستر پر سوئیں۔ گھر ہمارے ساتھ ساتھ، محبت انتہا —— جب میں نوکر ہو کر اوکاڑہ چلی گئی تو ہم بہت عرصہ تک ایک دوسری کو روز خط لکھتی رہیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے اسیما کے کئی خط آئے کہ مری ضرور آؤ۔ میں خود اوکاڑہ کی گرد آلود دوپہروں اور شاموں سے تنگ آگئی تھی۔

گوپا۔ تم نے لاہور کیوں نہ نوکری کر لی۔

سرتا (درد سے ہنستی ہوئی) یہ لمبی کہانی ہے۔ میں لاہور سے دور ہی رہنا چاہتی تھی (بات کو جاری رکھتے ہوئے) میں مری چلی گئی۔ اسیما کے گھر۔ ان دنوں گنیندر آیا ہوا تھا۔ مجھے اسیما سے معلوم ہوا کہ وہ

اس سے محبت کرتا ہے اور وُہ خود بھی اُس سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اسکی ماں بھی راضی ہے۔
لیکن اتنے دن اکٹھے رہنے کے باوجود اُس نے شادی کی درخواست نہ کی مختصر یہ میں نے گنی کو دیکھا
اسیمانے اس سے میرا تعارف بھی کرایا — اچھا خوبصورت درمیانے قد کا نوجوان
تھا۔ اسیما کچھ لمبی تھی لیکن بُرا جوڑ نہ تھا۔ اسیمانے مجھ سے کہا کہ میں اس سے ربط ضبط
بڑھاؤں اور اسے اسیما سے شادی کی درخواست کرنے پر مجبور کردوں" وُہ فیصلہ کرے"
اسیمانے کہا "میں اس بات کو لٹکا نہیں رکھنا چاہتی۔ ورنہ میری ماں کہیں اور ہاں کردیگی"
(گوپا ہنستی ہے)
— اگرچہ میں اس معاملہ میں بالکل نہ پڑنا چاہتی تھی لیکن اسیما کے اصرار سے تنگ آکر
میں نے گنی سے میل جول بڑھایا اور اسیمانے مجھ پر الزام لگا دیا کہ میں نے اسے اس سے
چھیننے کی کوشش کی۔

گوپا۔ تم نے ......
سنرنا۔ میں نے اسیما کی خاطر اس سے باتیں کیں — اسے سمجھایا کہ وُہ اس کی ماں سے
شادی کے لئے کہے۔ جب اسیما اس سے محبت کرتی ہے تو پھر جھجک کیسی لیکن یہ
عجیب بات ہے — میں اب تک بھی نہیں سمجھ سکی کہ کیوں اُس نے ایسا کیا —
پر جتنا ہی میں اس سے باتیں کرتی۔ اتنا ہی وُہ اس کی طرف سے کھنچتا جاتا رہتے اکہ
ایک دن اس نے ہنسی ہنسی میں مجھی سے شادی کی درخواست کردی۔

گوپا۔ تم سے؟ (ہنستی ہے)
سنرنا۔ میں نے فوراً جاکر اسیما سے کہدیا۔ اس کے سامنے ساری صورت حالات رکھ دی۔
اپنی پوزیشن واضح کردی۔ اس لڑکے کی بیوقوفی پر ہنسی بھی۔ سے سمجھایا کہ میرے دل میں

اس کے لئے ذرا سی بھی جگہ نہیں! ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ ہمارے درمیان کسی طرح کی یگانگت نہیں —— ذات پات، تعلیم و تربیت، خیالات اور عمر —— کسی طرح کی بھی نہیں لیکن اسیما کو یقین نہ آیا۔ اس نے مجھے نہ جانے کیسے کیسے طعنے دیئے —— "تم چاہے شادی نہ کرو"۔ اس نے کہا "لیکن تم اس سے کھیلنا ضرور چاہتی ہے۔ یہ جان کر تمہارے غرور کی تسکین ہوتی ہے کہ وہ بھی تمہارے چاہنے والوں میں سے ہے۔ . . . " نہ جانے وہ اور کیا کیا نہ کہتی لیکن میں اسی وقت وہاں سے چلی آئی سٹیشن پر مجھے تین گھنٹے گاڑی کا انتظار کرنا پڑا۔ میں نے مسافر خانے میں بیٹھے رہنا منظور کر لیا۔ پر واپس نہ گئی۔

(کمرے میں بے چینی سے ایک چکر لگاتی ہے)

—— اوکاڑہ پہنچکر میں نے اس واقعہ کو بھولنے کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن بھول نہ سکی۔ تب میں نے دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے ایک نظم لکھی۔

گوپا۔ اوہ! پھر وہ نظم تم نے ان کو بھیج دی، ہوں . . . . .

سترتا۔ مجھے اس بات کا خیال تک نہ تھا۔ لیکن میرے بھائی نے کہا کہ اسے کسی کو دکھا کر چھپوا دینا چاہیئے اور تب مجھے اس کا خیال آیا۔

(پھر انگڑائی لیتی ہے)

—— یہ بارش، یہ تو تھمتی ہی نہیں اور میں وہاں آج ہی پہنچنا چاہتی ہوں۔ کل مجھے واپس چل پڑنا ہے۔

(کچھ لمحہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی رہتی ہے)

—— دیکھو بارش نے جیسے بھاگتی ہوئی آندھی کو پکڑ کر باندھ لیا ہے۔ برستے ہوئے پانی میں

گرد کے اس تڑپتے سے سیاہ اژدھے کو دیکھو۔

(گوپا اس کے پاس چلی جاتی ہے)

— آسمان کافی صاف ہو گیا ہے۔ شاید بارش تھم جائے، مجھے چلنا چاہئے۔

گوپا۔ نہیں بادل گھُل رہے ہیں، جھڑی لگ جائے گی، رم رم جھم جھم آواز بھی نہ ہو گی بس برستا رہے گا، پرماتما کی بے آواز رحمت کی طرح!

سرتا۔ رحمت (ہنستی ہے) میرے لئے تو یہ مصیبت ہو گئی (مایوسی سے کمرے کا چکر لگاتی ہے۔ تخت پوش پر پڑی ہوئی کتاب کو دیکھ کر) یہ کونسی کتاب ہے؟

گوپا (ہنس کر) تمہارے مطلب کی نہیں علمِ نباتات پر ایک (TREATISE) ہے (ہنس کر) شاعری کی نسبت مجھے سائنس میں زیادہ دلچسپی ہے۔

(سرتا کتاب اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے)

— تم نے نام تو ان کا بتایا ہی نہیں۔ پریت نگر میں تو زیادہ تر سِکھ رہتے ہیں۔

سرتا (ہنس کر) نہیں وہ تو برہمن ہیں۔

گوپا۔ (تشویش کے لہجے میں) برہمن، اُن کا نام کیا ہے؟

سرتا گوتم!

گوپا (اور بھی تشویش سے) گوتم!

سرتا۔ کیوں۔ وہ تو کافی مشہور شاعر ہیں۔

گوپا (اُداس لہجے میں) ہاں وہ تو کافی مشہور شاعر ہیں۔

(کچھ بےچینی سے کمرے میں گھومتی ہے)

سرتا۔ (کتاب چھوڑ کر اس کے پاس جاتی ہوئی) تم انہیں جانتی ہو۔

گوپا۔ نہیں (کچھ وقفے کے بعد، جیسے کسی دوسری دُنیا سے بول رہی ہو) ایک بار اسی طرح بارش اور طوفان میں کچھ گھڑیوں کے لئے آئے تھے۔ باباجی بارہا ان کا ذکر کرتے ہیں۔

(پھر چپ چاپ سر جھکائے ایک چکر لگاتی ہے۔ سرتا تخت پوش پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے کی کوشش کرتی ہے لیکن جمائیاں آتی ہیں۔ اس لئے لیٹ جاتی ہے)

گوپا۔ (اچانک چونک کر) یہاں نہ لیٹئے، ادھر آئیے میرے ساتھ اندر کمرے میں، پندرہ بیس منٹ آرام کیجئے۔

سرتا (بیٹھے بیٹھے) مجھے سونا نہیں، میں تو ذرا یونہی ذرا کمر سیدھی....

گوپا۔ آپ بے چنت ہو کر ادھر لیٹئے گا، جونہی بارش کم ہوتی۔ میں آپ کو جگا دوں گی۔

(سرتا اُٹھتی ہے۔ گوپا اسے اندر کمرے میں لے جاتی ہے اور باہر کھڑے کھڑے ہی اشارہ کرتی ہے)

—— وُہ میری چارپائی ہے (ہنس کر) آپ اُس پر آرام کیجئے۔ اُمس محسوس ہو تو باہر کا دروازہ کھول لیجئے گا۔ یہ آنگن کی طرف کھلتا ہے اور وُہ باہر کی طرف۔

(سرتا اندر چلی جاتی ہے۔ گوپا دروازہ لگا کر پردے چھوڑ دیتی ہے اور پھر خاموشی سے سر نیچا کئے گھومتی ہے)

—— (کمرے میں گھومتے ہوئے اپنے آپ) ہوں! تو یہ شاعر بھی ہیں اور شکاری بھی (پھر چپ چاپ گھومتی ہے) اور یہ نظمیں (طنز سے ہنستی ہے) مقناطیس ہیں کتنی دور سے لوہے کو کھینچتی ہیں —— منٹگمری، اوکاڑہ، لاہور، امبالہ اور پھر یہ دیہات....

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

——لیکن مجھے تو کبھی نظمیں پسند نہیں ہوئیں (اور بھی دھیمے لہجے میں) پھر میں کیوں چلی آئی اس تپتے جلتے ویرانے میں.....

(دروازے پر اور بھی زور سے دستک ہوتی ہے۔ سرتا مُڑ کر دروازہ کھولتی ہے۔ گوتم واٹر پروف کوٹ پہنے نچڑتا ہوا داخل ہوتا ہے)

گوپا۔ اوہ! آپ.....

گوتم۔ ہاں میں (کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگتا ہوا) کیوں میں نے کہا تھا—سنیچر کو آؤں گا تم بھول ہی گئیں.....

گوپا۔ نہیں..... نہیں..... یہ..... یہ آندھی اور بارش۔

گوتم (رومال سے چہرہ پونچھتا ہوا) اُف یہ آندھی (آنکھیں ملتا ہوا) معلوم ہوتا ہے جیسے ویرانے کی ساری ریت ان آنکھوں میں پڑ گئی ہے اور یہ بارش..... اگر چوگا دالن سے جیون کا کوٹ نہ لے لیتا...... (ہنستا ہے) وُہ بھی ساتھ تھا۔ لیکن مغربی آسمان کے طور دیکھ کر وُہ تو رُک گیا۔ وہیں میں نے کہا۔ میں تو جاؤں گا—یکے والا نہ چلتا تو پیدل چلا آتا

(گوپا ہنستی ہے)

——(بوٹ جھاڑتا ہوا) تمہیں شاید اعتبار نہیں آتا۔ سچ مچ میں پیدل چلا آتا۔ یہ مذاق نہیں! کیا تم سمجھتی ہو کہ میں دس میل بھی پیدل نہیں چل سکتا۔

گوپا۔ (طنز سے) آپ کے متعلق تو نہیں کہہ سکتی۔ لیکن دُنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دس میل تو کیا.....

گوتم۔ تم اگر لاہور سے دِتی کے تک آسکتی ہو تو میں کیا پریت نگر سے یہاں تک نہیں

آسکتا

گوپا۔ میں تو بابا کو دیکھنے آئی ہوں۔ فٹ اچھلتے ہیں پر اُنہیں دُنیا میں۔۔۔۔

گوتم (خفت سے ہنستا ہے) شاید تم مجھے یہ مسرت بھی نہیں دینا چاہتیں (پھانس کر) مگر مجھے اس اقرار میں کوئی شرم نہیں کہ میں صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔ تم شاید اسے اپنی توہین سمجھتی ہو کہ ایک مفلس اور مغموم شاعر سے ملنے اتنی دور چلی آؤ۔

گوپا۔ دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔

(جا کر آرام سے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

گوتم (اس کے پاس جاتا ہوا) تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے۔ تم میری بے بسی پر ہنستی ہو۔

(گوپا چپ رہتی ہے)

—— میری زندگی ایک وسیع ویرانہ تھی گوپا اور اسی لئے میں نے شہر کے گنجان شور و شغب سے اپنا ناطہ توڑ کر اس ویرانے کو اپنا رفیق بنایا۔ جہاں دن کو گرم لُو کیکر اور برا نہہ کے درختوں تک کو جلاتی ہوئی چلتی ہے اور وسیع و عریض ویرانو میں رات جنڈ اور کریر کی جھاڑیوں میں سائیں سائیں کرتی ہوئی کھیلتی ہے اور جہاں کسی تنہا کسان کا گیت بے بس کی ایک دلدوز چیخ کی طرح دل کے پردوں کو چیرتا ہوا چلا جاتا ہے —— اس ویرانے کی خاموشی گویا میرے دل کی خاموشی بن گئی اور اس ویرانے کا سونا پن میرے دل کا سونا پن، لیکن جب سے تم نے اس ویرانے کو اپنی مد بھری آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس میں گلزار کھل اُٹھے ہیں۔ —— رنگین اور معطر پھولوں کے گلزار اور اس کی تپش مٹ گئی ہے اور ان جانے پنچھیوں نے اپنے رسیلے گیتوں سے اس کی خاموشیوں میں سنگیت بھر دیا ہے۔

گوپا (اچانک اُٹھ کر اپنے آپ) اوہ میں سمجھ گئی، میں سمجھ گئی ہے مجھے کس مقناطیس نے کھینچا...

گوتم۔ اس طرف دیکھو، ان کالی مدماتی گھٹاؤں کو ــــــ ان کی ایک نگاہ سے یہ ویرانے لہلہا اُٹھیں گے۔ دھان، کماد اور مکئی کی فصلیں، برسات کی ٹھنڈی ہواؤں سے سرسرائیں گی، شالا اور سینجی کی خوشبو سے مویشی بدمست ہو جائیں گے اور کریر کے لال گلابی پھولوں سے ویرانے روشن ہو اُٹھیں گے ــــــ میرے دل کے ویرانے کی طرف اس مدماتی گھٹا ہی کی طرح تم نے تاکا ہے۔

(گوپا چپ چاپ کمرے میں گھومتی رہتی ہے)

ــــــ اور میرا دل ہی نہیں، دل کے جذبات رنگین ہو گئے ہیں میری اُداسی مسکرا اُٹھی ہے ابھی میں نے ایک گیت لکھا ــــــ "آج میرے آنسوؤں میں یاد کس کی مسکرائی"

ــــــ ہاں مسکرائی، پہلے میں اگر ایسا گیت لکھتا تو یاد رو سکتی تھی، تلملا سکتی تھی، لیکن مسکرا نہ سکتی تھی۔ لیکن آج (گاتا ہے) ــــــ آج میرے آنسوؤں میں یاد کس کی مسکرائی

گوپا (اچانک پلٹ کر) میں بتا دوں کس کی......

گوتم (آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے) کہو گوپا، کس کی.... کہو کس کی....

(گوپا قہقہہ لگاتی ہے)

گوتم (شش و پنج میں ہے کہ اس کی اس ہنسی پر خوش ہو یا غمگین) کیوں؟

گوپا (طنز سے ہنستے ہوئے) میں سب جان گئی ہوں، سب کچھ سمجھ گئی ہوں۔

گوتم (تذبذب سے) بتاؤ۔

گوپا۔ سرتا کی۔

گوتم (آنکھوں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے) سرتا کی؟

گوپا۔ اوکاڑے والی مسٹریس کی۔

گوتم (آہستہ سے) تُم اُسے کیسے جانتی ہو۔

گوپا۔ (چپ)

گوتم۔ کیا وُہ تمہارے ساتھ پڑھتی ہے۔ کیا اُس نے تمہیں کچھ لکھا ہے۔

گوپا۔ اُس نے مجھے لکھا ہے کہ میں ان سے محبت کرتی ہوں

گوتم۔ پگلی!

گوپا (طنز سے) اگر محبت کرنا پاگل پن ہے . . . . .

گوتم۔ نہیں . . . . لیکن . . . . .

گوپا۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ وُہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں

گوتم (ہنس کر) محبت۔

گوپا (چوٹ پر چوٹ لگاتی ہوئی) اگرچہ آپ نے اسے کبھی نہیں دیکھا لیکن وُہ لکھتی ہے کہ کسی انجانی طاقت نے ہمارے دلوں کے تار ملا دیئے ہیں اور وُہ آپ سے ملنے کیلئے بے چین ہے۔ آپ نے اسے لکھا . . . . .

گوتم (چونک کر) میں نے اُسے کیا لکھا . . . . .

گوپا۔ (نفرت اور طنز سے) اگر تم چند دنوں کیلئے آجاؤ تو میری یہ اُداس اور خاموش گھڑیاں گنگنا اٹھیں اور میں جانتی ہوں وُہ چلی آئے گی۔ وُہ لکھتی ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بے پناہ محبت ہے . . . .

گوتم۔ (طنز سے ہنستا ہے) بے پناہ محبت . . . .

گوپا۔ کیوں . . . . .

گوتم۔ نہ میں نے اُسے دیکھا نہ جانا۔ وہ ایک پاگل رومانی لڑکی ہے اور میں نے اس کا رومان توڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

گوپا۔ (جل کر) آپ کتنے رحمدل ہیں ہمیشہ اُس کے خطوں کا واپسی ڈاک سے جواب دیتے رہے کہیں اس کے رومان کے بنتے ہوئے محل میں ذراسی بھی دراڑ نہ آجائے۔ اپنی میٹھی درد بھری باتوں کا مسالہ لگاتے رہے کہ وہ محل مضبوط تر ہوتا جائے اور پھر اسے اپنے پاس بلا کر اس محل کی تکمیل کو بھی آپ نے اپنا فرض سمجھا۔ آپ کتنے رحمدل ہیں ——— کتنے رحمدل!

گوتم۔ اوہ میں سمجھا۔ میں حیران تھا تمھاری اس بے اعتنائی پر۔ میں اس بارش اور طوفان میں اتنی تکلیف برداشت کر کے آیا۔ پر تم نے مجھے چائے تک کے لئے نہیں پوچھا۔

گوپا (طنز سے) میں رحمدل جو نہیں ......

گوتم (بگڑی بات بنانے کی کوشش کرتے ہوئے) تمہیں معلوم تو کچھ ہے نہیں۔ یونہی جلی کٹی سنا رہی ہو۔

گوپا۔ مجھے آپ سے بھی زیادہ معلوم ہے اور سرتا سے بھی ——— میں جذبات کی رو میں بہہ جانے والی بھولی بھالی پاگل رومانی لڑکی نہیں میں شعروں کی نسبت سائنس کو زیادہ پسند کرتی ہوں لیکن مقناطیس کا اثر مجھ پر بھی ہو چلا تھا ——— اسی طرح بارش اور طوفان میں بھیگتے ہوئے پچھلے سال جب آپ آئے تھے تو آپ کی باتوں نے مجھ پر اثر کیا تھا اور دوسروں کی ہمدردی کو جیت لینے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ آپ نے کہا ——— "گوتم اور گوپا ——— شاید ہم ازل سے ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں اور آپ کے یہ الفاظ میری سماعت پر چھا کر رہ گئے۔ ان سب پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی میں سمجھنے لگی تھی کہ شاید آپ سچ کہتے ہیں، لیکن میرے پاؤں بالکل نہیں

اکھڑے۔ ہرنا کی باتیں سُن کر مجھ پر سب حقیقت کُھل گئی

گوتم۔ نہ جانے اُس نے تمہیں کیا لکھ دیا ہے ——— بات بس اتنی ہے کہ اُس نے مجھے نظم ٹھیک کرنے کے لئے بھیجی اور مَیں نے اُس کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا ہاں ہیں اُس کے خطوں کا جواب دیتا رہا۔ یہ تو محض کرٹسی (COURTSEY) کا ناطہ تھا لیکن اُس نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی۔ . . .

گوپا۔ اور آپ نے اپنی اداسی اور تنہائی کا ذکر کر کے اُس کے دل میں اس خواہش کو پیدا نہیں کیا۔ اپنی مصیبتوں کی کہانی کہہ کہہ کر اس کی ہمدردی کو محبت کے ایک بے پناہ جذبے میں تبدیل نہیں کیا ——— اُس کے تصوّر کی دُنیا میں ایک اداس اور مغموم شاعر ہے جسے مصیبتوں اور پریشانیوں نے غمگین بنا دیا ہے۔ اس شاعر کا غم بٹانے کے لئے اُس کے زخموں پر محبت کا ٹھنڈا پھاہا رکھنے کے لئے وُہ بے تحاشہ چلی آئیگی۔ اُسے کیا معلوم وہ شاعر شکاری ہے۔ . . . .

گوتم۔ گوپا . . . . .

گوپا۔ درد میں بسی ہوئی میٹھی میٹھی باتوں کا دانہ بکھیر کر پنچھی کو پھنسانا جانتا ہے۔ وُہ کیا جانے کہ وُہ پر کاٹ کر اُسے چھوڑ دے گا۔ پنجرے تک میں بند کر کے نہ رکھے گا۔

گوتم۔ گوپا . . .

گوپا۔ میں پوچھتی ہوں شاعر کی نظموں میں اور اُس کے کردار میں اتنا فرق کیوں ہے؟ کیا یہ اچھا نہ تھا کہ وُہ شاعر شاعر نہ ہو کر صرف انسان بنتا (کمرے میں چکر لگاتی ہے) صرف انسان بنتا۔

گوتم۔ تم میری بات تو سنو گوپا۔

گوپا (پلٹ کر) ایسی ہی باتوں سے آپ مجھے پھنسانا چاہتے ہیں۔ لیکن میں اچھی طرح جان گئی ہوں۔ نظموں کی دُنیا کا مظلوم، ستم رسیدہ، غمگین شاعر حقیقی دُنیا کا ہنس مکھ شکاری ہے جسے اپنے شکار کو پھنسانے میں رس ملتا ہے اور جو اس کا تڑپنا دیکھ کر ذرا بھی تو نہیں پسیجتا۔

گوتم۔ گوپا۔ ۔ ۔ ۔

گوپا۔ (آہستہ آہستہ گھومتے ہوئے) تم سرلا سے صرف کھیل رہے ہو یا اگر اس سے نہیں کھیل رہے تو مجھ سے کھیل رہے ہو (ہنستی ہے) اور نہ جانے اور کون کون تمہارے اس خوفناک کھیل کا کھلونہ بنی ہوئی ہیں۔

گوتم۔ گوپا۔ ۔ ۔ ۔

گوپا۔ (پلٹ کر) کیا تم یہ سب باتیں اس کے مُنہ پر کہہ سکتے ہو۔

گوتم۔ باتیں۔ ۔ ۔ ۔

گوپا۔ کہ تم اس سے محبت نہیں کرتے کہ وُہ ایک پاگل رومانی لڑکی ہے کہ تم نے صرف اس پر رحم کر کے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گوتم۔ مَیں نے کبھی اس سے محبت کا اظہار نہیں کیا۔

گوپا۔ (چِڑ کر) تم اس کے مُنہ پر کہہ دو گے۔

گوتم۔ (جھجکتے ہوئے) مَیں۔ ۔ ۔ مَیں۔ ۔ ۔ مَیں اُس کے مُنہ پر کہہ دوں گا۔

گوپا۔ وَولو۔

(نوکر دروازے سے جھانکتا ہے)

گوپا۔ اس کمرے میں وُہ بی بی جی جو سوئی ہوئی ہیں، فوراً ان کو جگا دو۔

گوتم۔ (چہرے کا رنگ فق ہو جاتا ہے) کیا وہ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا سرتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گوپا۔ ہاں سرتا ـــــ آپ کے اس زخمی دل پر محبت کا ٹھنڈا پھاہا رکھنے کیلئے اس بارش اور طوفان میں ایک ٹوٹے سے یکے پر وہ اتنی دور سے چلی آتی ہے (دولو کو کھڑے دیکھ کر) کھڑا کیوں ہے جا بلا لا انہیں۔

دولو۔ جی وہ تو چلی گئیں۔

گوپا۔ چلی گئی!

دولو۔ آپ کو ان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ادھر ہی سے چلی گئیں۔ کہتی تھیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے آج ہی پربت نگر پہنچنا ہے۔ بہن جی سے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔

گوپا۔ لیکن کپڑے

دولو۔ انہوں نے کہا تھا۔ کل آتے سمے لے جاؤں گی۔

گوپا۔ مقناطیس کی کشش ابھی اس کے لئے قائم ہے۔ لوہ چون کی طرح وہ کھنچی چلی جائیگی، پر میرے لئے مقناطیس ٹوٹ گیا۔ مجھ پر اس حقیقت کھل گئی (طنز سے ہنس کر) پاگل رومانی لڑکی ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن موقع آنے پر کون پاگل اور رومانی نہیں ہو جاتا (مڑ کر ہنستے ہوئے گوتم سے) میں چائے پوچھنا تو بھول ہی گئی ہے کہئے چائے پیجئے گا (اور بھی ہنستے ہوئے) کپڑے بدل ڈالئے گا۔ بھیگ گئے ہیں ـــــ

(پردہ)

معجزے

افراد

ترکی ٹوپی والا	گھنٹی والا
لمبی چوٹی والا	بزرگ
کرپان والا	اور دوسرے لوگ

(اسٹیج کے بائیں کونے میں بائیبل سوسائٹی کا محراب دار دروازہ ہے، جس کی محراب کے اوپر خوشخط موٹے حروف میں لکھا ہے۔

"یسوع مسیح نے کہا اُٹھ اور دوشیزہ اُٹھ کھڑی ہوئی"۔ یہ بائیبل سوسائٹی ایک بازار میں ہے سو دائیں کونے میں دائیں طرف کی دکان کا نصف بورڈ (جس پر بڑے بڑے الفاظ میں "جمیل اینڈ" کو لکھا ہوا ہے) اور نصف دروازہ دائیں کونے میں نظر آتا ہے۔ دکان اور بائیبل سوسائٹی کی حدیں سٹیج کے درمیان ملتی ہیں۔ بائیبل سوسائٹی کی بلڈنگ کا رنگ لال ہے اور دوسری دکان کا موتیا۔ دونوں دکانوں کے آگے فٹ پاتھ اور اُس کے ساتھ (دائیں طرف سے بائیں طرف کو یا بائیں سے دائیں کو جانے والی) تارکول کی سڑک نظر آتی ہے۔

پردہ اُٹھنے پر بازار عام طور پر چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ دو چار آدمی اپنے خیال میں محو بازار میں

چلے جاتے ہیں۔ ایک فیشن ایبل لیڈی بائیں طرف کی دکان میں جاتی ہے۔ ایک چھٹی رسان بائیبل سوسائٹی میں داخل ہوتا ہے۔

کچھ لمحے بعد دکان کی طرف سے ایک مجنون سا شخص سر پر ترکی ٹوپی رکھے، گلے میں کھلے گریبان کی میلی پھٹی قمیص اور ٹخنوں سے اونچا (قدرے تنگ) اور کثرتِ استعمال کے باعث گھٹنوں سے ذرا آگے کو بڑھا ہوا پاجامہ پہنے، سگریٹوں کے ایک خالی ٹین کے بکس کو کھینچتا ہوا داخل ہوتا ہے اور دونوں دکانوں کے درمیان آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

لمحہ بھر کے لئے وُہ راہ چلتے لوگوں کو دیکھتا ہے۔ پھر باآواز بائیبل کے سوسائٹی کے محراب دار دروازے پر لکھے ہوئے موٹو کو پڑھتا ہے)

—— "یسوع مسیح نے کہا اُٹھ اور دوشیزہ اُٹھ کھڑی ہوئی . . . .

—— (بائبل سوسائٹی کے دروازے کی طرف دیکھ کر) بلاؤ اپنے یسوع مسیح کو کہ اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے (پھر دانت پیستا ہوا، منہ چڑا کر اور راہ چلتوں کو سنا کر) یسوع مسیح نے کہا اُٹھ اور دوشیزہ اُٹھ کھڑی ہوئی (دروازے کی طرف دیکھ کر) بلاؤ اپنے اس مسیح کو کہ اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے۔

(اس کی آواز سن کر تین چار راہ چلتے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جن میں ایک لمبی چوٹی والا بھی ہے)

—— (بدستور راہ چلتوں کو سنا کر) مسیح کا سب سے بڑا معجزہ یہ تھا کہ وُہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے تو پھر وُہ کیوں یہاں آ کر میری اس مچھلی کو زندہ نہیں کرتے (دروازے کی طرف دیکھ کر) نکالو اپنے یسوع مسیح کو کہ وہ اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے۔

(کچھ اور لوگ آجاتے ہیں جن میں ایک کرپان والا بھی ہے)

لمبی چوٹی والا۔ کیوں بھئی بات کیا ہے؟

ترکی ٹوپی والا۔ المبلغ میں میں نے ایک معرکے کا مضمون سپردِ قلم کیا تھا جس میں عیسائی مذہب کی بنیادی خامیوں سے نہایت مدلل بحث کی تھی۔ میرے اس مضمون کا کوئی معقول جواب دینے کی بجائے (دروازے کی طرف دیکھ کر) پادری بدھاوا رام نے اپنے اخبار میں رسول پاک کے معجزات پر اعتراض کئے۔ معراج کی حقیقت کو سمجھنا پادری بدھاوا رام کے بس کی بات نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ خداوند کریم نے رسول پاک کو ساتوں آسمانوں کی سیر کرائی اور وہ بھی اس قدر قلیل عرصے میں کہ جس دروازے سے وہ گئے تھے۔ اس کی کنڈی ان کے واپس آنے تک ابھی ہل رہی تھی۔ اس معجزے کی کئی تفسیریں ہو سکتی ہیں لیکن ان پر غور و خوض کرنے کی بجائے پادری بدھاوا رام نے بے معنی اور لغو اعتراض کیا ہے۔

کرپان والا (آگے بڑھ کر) لیکن میاں اس ٹین کے ڈبے میں کیا ہے؟

ترکی ٹوپی والا۔ مچھلی

کرپان والا۔ مچھلی؟

ترکی ٹوپی والا۔ ہاں مردہ مچھلی —— میں پادری بدھاوا رام کو چیلنج دینے آیا ہوں کہ اگر سچ مچ یسوع مسیح میں یہ طاقت تھی کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور اگر سچ مچ وہ خدا کے بیٹے تھے تو وہ اپنے اس خدا کے بیٹے کو بلائے کہ وہ آکر میری اس مردہ مچھلی کو زندہ کر کے اپنی مسیحائی کا ثبوت دے۔

لمبی چوٹی والا۔ (ہنستا ہے) پادری بدھاوا رام (اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک

دوسرے لمبی چوٹی والے آدمی سے) ارے یہ وہی بدھاوا رام ہے جسے ہم نے شدھ کیا تھا۔ لیکن جو ہمارے کٹھن سدھانتوں کو نہ مان سکا تھا۔

(پادری بدھاوا رام دروازے سے جھانکتا ہے)

——ہاں پادری صاحب بلائیے اپنے خدا کے بیٹے کو کہ وہ اپنا کرشمہ دکھا کر اس مچھلی کو زندہ کرے (لوگوں کو سُنا کر) اگر خدا امر اور سرودیاپک ہے تو خدا کا بیٹا امر اور سرودیاپک کیوں نہ ہوگا اور کیوں نہ یہاں آکر اس مُردہ مچھلی کو زندہ کرے گا۔

(کچھ اور لوگ بھیڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک سفید ریش بزرگ چپ چاپ آکر بھیڑ کے ایک طرف کھڑے تماشہ دیکھنے لگتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں بیگ اُٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں گھنٹی لئے ایک شخص سب کے پیچھے آکر کھڑا ہوتا ہے)

ترکی ٹوپی والا۔ (نعرہ لگاتا ہے) آئے خدا کا بیٹا اور میری اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے۔

(پادری بدھاوا رام پھر اندر چلے جاتے ہیں)

لمبی چوٹی والا۔ ایک جلسے میں پادری بدھاوا رام نے آریہ سماجیوں کو موش پنتھی کہا تھا اور اس بات کا مذاق اڑاتے ہوئے مہرشی کی ذات پر حملے کئے تھے (لیکچر دینے کے انداز میں ہوا میں ہاتھ گھماتے ہوئے اور ایڑیاں اٹھاتے ہوئے) مہرشی دیانند پورن برہمچاری تھے۔ ان کے مکھ پر اُوجت تیج اور ان کے انگوں میں اپار شکتی تھی۔ اپنے یوگ بل سے وہ ایسی آشچریہ جنک باتیں کر سکتے تھے۔ جو دوسروں کو چمتکار معلوم ہوتی تھیں۔

کٹھن سدھانتوں = سخت اصولوں۔ امر = زندہ جاوید۔ سرودیاپک = ہر جگہ موجود۔ پراپت = حاصل۔ اُوجت = عجیب۔ آشچریہ جنک = حیرت انگیز۔ چمتکار = معجزہ۔ شکتی وان = طاقت والے۔ پرکھ = پرش آدمی۔

جالندھر میں ٹیکا صاحب کی گاڑی کو انہوں نے پیچھے سے پکڑ لیا۔ گھوڑے زور لگا کر تھک گئے۔ لیکن وہ تو بیچاری کا بل تھا۔ اُس سے مس نہ ہوئی گاڑی معجزہ یہ ہوتا ہے، اسے عقل قبول کرتی ہے۔ لیکن ......

کرپان والا۔ (جوش سے آگے بڑھ کر) انہی پادری صاحب نے ہمارے گورونانک صاحب کے معجزوں پر بھی نکتہ چینی کی تھی اور مودی خانے کی بات کو لے کر مذاق اڑایا تھا۔

کرپان والے کا ساتھی۔ وہ تو ستیہ وان پرکھ تھے۔ ننکانہ صاحب کے لوگ اچھی طرح اس بات کو جانتے ہیں۔

کرپان والا۔ گورونانک صاحب کے بہنوئی جے گوپال لودھی سلطان کے ہاں ملازم تھے۔ گورونانک صاحب کے پتا کالو رام نے اپنے بیٹے کو آوارہ سمجھ کر جے گوپال سے کہا کہ بھئی یہ تو سادھو سنتوں کی صحبت میں رہ کر آوارہ اور نکما ہو رہا ہے۔ اسے کہیں ٹھکانے پر بٹھاؤ۔ جے گوپال نے گورو صاحب کی سفارش کر کے انہیں مودی خانے کا انچارج لگوا دیا۔ گورو صاحب دریا دل فقیر، وہ کیا جانیں حساب کتاب۔ جو سائل آتا۔ ان کے در سے خالی نہ جاتا۔ سادھو سنت، پیر فقیر سب مودی خانے سے من مانی خیرات پانے لگے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر سلطان تک بھی جا پہنچی کہ تمہارا مودی خانہ ہی لٹا جا رہا ہے۔ بس سلطان نے جانچ پڑتال کا حکم دیا۔ مودی خانے کا حساب ہونے لگا۔ گورو صاحب ترازو لے کر تولنے لگے۔ ایک دو تین چار ...... تیرہ پر جا کر انہوں نے آگے گننے کی بجائے تیرہ، تیرہ، میں تیرا، میں تیرا کا پاٹھ شروع کر دیا۔ سارا مودی خانہ تل گیا اور جتنا گورو صاحب کے چارج میں دیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ نکلا (دروازے کی طرف دیکھ کر) پادری بدھا وارام ایک جلسے میں کہہ رہے تھے۔

—— "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟" میں اُن سے پوچھتا ہوں —— یسوع مسیح نے کس طرح روٹی کے دو ٹکڑوں اور تین مچھلیوں کو برکت دے کر ان سے اپنے ہزاروں پیرووں کی بھوک مٹائی تھی اور سب کے کھا چکنے کے بعد بھی چھ ٹوکرے بھر روٹیاں اور مچھلیاں بچ گئی تھیں۔

ترکی ٹوپی والا۔ آئے مسیح اور اپنا معجزہ دکھا کر میری اس مُردہ مچھلی کو زندہ کرے

سفید ریش بزرگ (جو بڑے انہماک سے ان لوگوں کی باتیں سنتے رہے ہیں) اے بھائی، معجزے اب بھی ہوتے ہیں۔ اُنہیں دیکھنے کے لئے صرف آنکھیں چاہئیں۔

(گھنٹی والا زور سے اپنی گھنٹی بجاتا ہے)

ترکی ٹوپی والا۔ (پھر نعرہ لگاتا ہے) بلاؤ مسیح کو کہ میری اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے۔

گھنٹی والا (گھنٹی بجاتا ہوا اور بھیڑ کو چیر کر آگے آتا ہوا) میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔

(لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہیں)

—— (بدستور گھنٹی بجاتا اور آگے بڑھتا ہوا) میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔

(بھیڑ کے درمیان آ کر یہی صدا لگاتا ہوا گھومتا ہے۔ جس سے ایک چھوٹا سا دائرہ بن جاتا ہے اور ترکی ٹوپی والے میاں صاحب اور گھنٹی والا درمیان رہ جاتے ہیں گھنٹی والے نے کشتی نما ٹوپی، بے حد نفیس کھلے کالر کی قمیص، اور اس پر کوٹ پہن رکھا ہے۔ اس کی کمر میں بڑے گھیر کی شلوار ہے اور پاؤں میں چمکتے پمپ شو مونچھیں اُس کی بڑی بڑی ہیں اور نوکوں کو اس نے شاید گوند لگا رکھا ہے —— اس کے مقابلے میں ترکی ٹوپی والا محض بھکاری معلوم ہوتا ہے)

—— (درمیان میں اپنا بیگ رکھ کر اور ایک بار پورے زور سے گھنٹی بجا کر) میں مچھلی زندہ کرتا ہوں، میں مچھلی زندہ کرتا ہوں (ایک لمحہ تک صرف گھنٹی بجاتا ہے) اس دم آپ کے دیکھتے دیکھتے اس مچھلی کو، اس مردہ مچھلی کو زندہ کردوں گا۔ صرف مجھ پر اعتقاد رکھئے

سفید ریش بزرگ۔ (جیسے اپنے آپ ہنس کر) اعتقاد ہی تو معجزوں کی کنجی ہے۔

گھنٹی والا۔ (ایک بار پھر گھنٹی بجاتا ہوا) لیکن مہربان حضرات اس سے پہلے کہ میں اس سگریٹ کے بکس میں پڑی ہوئی مردہ مچھلی کو زندہ کروں۔ میں مُردہ اور بے جان انسانوں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں حضرات انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کی جان ہزاروں بلکہ لاکھوں مچھلیوں سے قیمتی ہے۔ مچھلی کو زندہ کرنے سے پہلے میں انسانوں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں

کمہ پان والا۔ انسانوں کو؟

گھنٹی والا۔ مہربان آج زندہ انسان کہاں ہیں؟ سو میں سے ایک شخص کے چہرے پر زندگی کی رمق دکھائی دیتی ہے۔ مرجھائے ہوئے زرد چہرے، بے نور اداس آنکھیں، سوکھے ہڈیوں سے جسم —— یہ زندہ انسان ہیں —— حضرات یہ چلتے پھرتے مردے ہیں —— چلتے پھرتے مردے —— وہ دم خم، وہ تاب وتواں، وہ شجاعت ودلیری، وہ حوصلہ و ہمت اب کہاں ہے؟ (گھنٹی بجا کر) اور حضرات ایسا کیوں نہ ہو۔ آج ہمیں ضروریات زندگی ہی میسر نہیں (اور بھی اونچی آواز میں سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے) کتنے لوگ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ خالص دودھ اور گھی استعمال کرتے ہیں . . . .

. . . . . . خالص دودھ، گھی عام لوگوں کے لئے ایسی نعمتیں بن گئی ہیں جن کا ملنا جنت میں ممکن ہو تو ہو۔ اس دنیا میں ممکن نہیں

بزرگ۔ سچ ہے بھائی سچ ہے۔

(بازار چلتا رہتا ہے۔ کچھ لوگ آتے اور کچھ لوگ جاتے رہتے ہیں)

گھنٹی والا۔ دودھ گھی تو دور، ہمیں خالص ہوا اور پانی بھی میسر نہیں۔ یہ مچھلی مردہ ہے کیوں؟ اس لئے کہ یہ پانی کے باہر ہے۔ اسے اس کی غذا میسر نہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ زندہ درگور ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمیں ہماری غذا میسر نہیں۔ دیہات میں جائیے۔ اب بھی آپ کو چھ چھ، سات سات فٹ اونچے سینتیس سینتیس انچ چوڑے سینوں والے جوان ملیں گے —— کھلی ہوا، تازہ دودھ اور خالص پانی —— لیکن کون ہے ماں کا لال جو سینے پر ہاتھ مار کر اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُسے یہ سب میسر ہیں۔

(بزرگ متاثر ہو کر سر ہلاتے ہیں کہ ٹھیک ہے بھائی تو جو کہہ رہا ہے، سچ کہہ رہا ہے)

گھنٹی والا۔ (گھنٹی کو پھر ایک بار بجاتا ہوا) لیکن یہ غریب جانور اپنی موت کا خود ذمہ دار نہیں۔ اسے میاں صاحب پانی سے نکال لائے ہیں۔ اس کا بس چلتا تو یہ اپنی زندگی اپنے ہاتھوں نہ دیتا۔ لیکن ہم اشرف المخلوقات انسانوں میں سے بیشتر اپنی زندگی کو، زندگی کے بیش بہا جوہر کو، اپنے ہاتھوں اپنے بچپن یا جوانی میں گنوا دیتے ہیں۔ صاحبان! جو غذا ہم کھاتے ہیں۔ اس کا رس بنتا ہے۔ اس سے خون، خون سے چربی، چربی سے ہڈی، ہڈی سے گودا اور گودے سے وُہ جوہر بنتا ہے۔ جس سے ہمارے دل و دماغ اور اعصابی نظام کو تقویت پہنچتی ہے۔ جس سے مرد، مرد کہلاتا ہے۔ یہی وُہ جوہر ہے جو ہم اپنی نادانیوں کے باعث بچپن یا جوانی میں گنوا دیتے ہیں۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی مُردوں سے بدتر ہو جاتے ہیں۔

اس بات کا سہرا استاد مرحوم فخر الاطبا مسیح الملک خدائے حکمت، جناب فخر الدین صاحب کے سر ہے کہ انہوں نے اس جوہر کو برقرار کرنے اور مردہ کو پھر سے مرد بنانے کے لئے وہ نسخہ حاصل کیا جس سے مردہ سے مردہ انسان بھی زندگی کی انگڑائی لینے لگتا ہے۔

(پھر دائرے میں چکّر لگاتا ہے)

——— میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ میں مچھلی زندہ کرتا ہوں (پھر اپنی جگہ کھڑے ہو کر گھنٹی بجاتے ہوئے) میاں صاحب اس مچھلی کو یہاں میرے سامنے لائیے (میاں صاحب بکس کو کھینچ کر اس کے سامنے لاتے ہیں) ہاں مہربان اس میدان میں اس مچھلی کو رکھ دیجئے۔ میں چشم زدن میں آپ سب کے دیکھتے دیکھتے اسے زندہ کر دوں گا۔ ایسی ایسی دوائیں استاد مرحوم نے تیار کیں کہ بارہا مرتے مرتے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سانپ کے زہر کی ایک دوا میرے پاس ہے۔ مالوے اور ماجھے کے بنجر علاقوں میں بیسیوں تنومند جاٹ ہر سال سانپوں کا شکار ہو جاتے تھے استاد مرحوم کے حکم سے میں نے ایک بار وہاں جا کر تقسیم کی۔ کیا مجال جو پچھلے دس سال میں سانپ کاٹے سے موت کی ایک بھی واردات ان علاقوں میں ہوئی ہو (بیگ سے ایک نیلی سی ٹکیا نکالتا ہے) مہربان! جس طرح لوہا لوہے سے ہی کٹتا ہے، اسی طرح زہر کا اثر بھی زہر ہی سے زائل ہوتا ہے۔ استاد مرحوم کہا کرتے تھے "زہر کو کاٹنے کے لئے زہر مہابلی ہے" اور اس لئے انہوں نے اہم زہروں کو سانپ کے زہر میں کھرل کر کے، دن رات کی محنتِ شاقہ کے بعد، یہ ٹکیا تیار کی۔ جہاں کہیں سانپ بچھو کنکھجورا، شہد کی مکھی، بھڑ یا کوئی اور زہریلا جانور کاٹ کھائے۔ لعاب دہن یا پانی

میں گھس کر اسے لگا دیجئے۔ منٹوں ہی میں زہر کا اثر زائل ہو جائیگا (گھنٹی بجاتا ہوا) جس بھائی کو ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کرے۔ استاد مرحوم نے کہا تھا "بیٹا زندگی دینا پر دام نہ لینا!" اس ٹکیہ کی قیمت میرے لئے حرام ہے (بیگ سے چند اور ٹکیاں نکالتے ہوئے) جس جس بھائی کو ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کرے۔

(ٹکیاں بانٹنے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ سب کے سب ہاتھ کھڑا کر دیتے ہیں)

—— لیکن اب سب لوگوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے (دی ہوئی ٹکیاں واپس لے کر) کیا آپ سب کو ضرورت ہے؟ (چھوٹے سے ایک لڑکے کی طرف دیکھ کر) کیوں بے تجھے کونسا سانپ کاٹے جاتا ہے۔

(لوگ ہنستے ہیں۔ لڑکا خجل ہو کر ہاتھ نیچے کر لیتا ہے)

—— حضرات، اس طرح کام نہ چلے گا۔ ضرورت اور غیر ضرورت مند کا پتہ لگانے کے لئے اُستاد مرحوم ایک گر ہمیں بتا گئے ہیں (گھنٹی بجاتے ہوئے) دیکھئے مہربان! اس ٹکیا کی قیمت چار آنے ہے۔ انسانی جان کی قیمت لاکھوں روپے سے بھی زیادہ ہے لیکن اس جان کو بچانے والی اس ٹکیا کی قیمت صرف چار آنے ہے۔ استاد مرحوم نے کہا تھا۔ بیٹا زندگی دینا دام نہ لینا۔ حضرات یہ دام نہیں یہ صرف لاگت ہے۔ اس ٹکیا کی قیمت صرف چار آنے ہے۔ اب جن اصحاب کو ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کریں۔

(کچھ لوگ ہاتھ گرا دیتے ہیں۔ کچھ اس تذبذب میں ہیں کہ ہاتھ کھڑے رکھیں یا ڈر رکھیں۔ انہی کی طرف مخاطب ہو کر)

—— چار آنے! اس ٹکیا کی قیمت صرف چار آنے ہے۔ صرف ضرورت مند اصحاب ہاتھ کھڑا کریں۔

(صرف پانچ چھ اشخاص ہاتھ کھڑے رکھتے ہیں۔ باقی گرا دیتے ہیں)

—— لائیے جناب چار چار آنے (پیسے لیتا ہوا) لیکن ہاتھ کھڑے رکھئے گا مہربان!

(سب پیسے وصول کر لیتا ہے اور عجیب فراخدلی سے مسکراتا ہے)

—— (ہاتھ کے پیسوں کو دیکھتے ہوئے) دیکھئے جن اصحاب کو ضرورت تھی۔ انہوں نے قیمت دیکر بھی ٹکیا خرید لی۔ مہربانو! آپ کو سچ مچ ضرورت ہے۔ لیجئے پیسے بھی لیجئے اور ٹکیا بھی لیجئے۔

(جن جن لوگوں نے پیسے دئے تھے۔ ان کو پیسے اور ٹکیا دونوں چیزیں واپس کرتا ہے)

—— (پھر اپنی جگہ آکر اسی فراخ دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ) استاد مرحوم نے کہا تھا بیٹا زندگی دینا۔ دام مت لینا (زور سے گھنٹی بجاتے ہوئے) ہاں تو میاں جی آپ ہی اس مچھلی کو لائے ہیں نا۔

ترکی ٹوپی والا۔ ہاں بھئی میں ہی لایا ہوں۔

گھنٹی والا۔ زندہ لائے تھے یا مُردہ؟

ترکی ٹوپی والا۔ مُردہ!

گھنٹی والا۔ (عجیب اعتماد کیساتھ) دیکھ لیجئے زندہ تو نہیں ہو گئی۔

ترکی ٹوپی والا (مچھلی کو اٹھا کر پھر وہیں رکھتے ہوئے) نہیں جی مردہ ہے۔

گھنٹی والا۔ (مجمع کی طرف متوجہ ہو کر) راجہ بھرتری ہری نے ایک جگہ لکھا ہے —— سمندر قطرہ بھر شہد سے میٹھا ہو سکتا ہے۔ بید مجنوں کو پھول آسکتے ہیں لیکن جاہل سے بات منوائی نہیں جا سکتی۔ وجہ کیا ہے مہربان؟ یہی کہ جاہل کو اپنی بات کے

علاوہ کسی دوسرے کی بات پر یقین نہیں آتا اور عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔
(گھنٹی بجاتا ہوا دائرے میں چکر لگاتا ہے) یقین کیجئے حضرات! یہ مچھلی جو اس وقت
ٹین کے ڈبے میں بےحس و حرکت پڑی ہے۔ زندگی کی تڑپ سے اچھل اچھل پڑے گی۔
خود استاد مرحوم ایک بار اپنی جوانی میں اس مچھلی کی طرح بےجان سے ہو گئے تھے۔ انہوں
نے خود ایک بار بتایا تھا کہ قبیح عادات کی وجہ سے وُہ خود جوانی میں زندگی کے جوہر کا خاتمہ
کر بیٹھے تھے علاج معالجہ سے مایوس ہو کر وہ پہاڑوں کو نکل گئے تھے۔ تاکہ ممکن
ہے کوئی قابل سنیاسی مل جائے تو ان کی مشکل کشائی ہو۔ ستمبر ۱۸۵۲ء کی بات ہے
کہ وہ گڑھوال کے مشہور شہر کرن پریاگ میں پہنچے۔ وہاں سرائے میں انہیں
اس خضر صورت فقیر کی ملاقات کا شرف ملا۔ جس نے انہیں نہ صرف دوبارہ
زندگی دی بلکہ طب کا وہ شوق عطا کیا جس کی وجہ سے استاد مرحوم نے ہزار دل
مایوس انسانوں کی امید بندھائی! اور انہیں طاقت ور اور توانا بنا کہ زندگی کی کشمکش
کے لئے تیار کیا (بائیبل سوسائٹی کے دروازے پر لکھے ہوئے موٹو کو دیکھ کر) یسوع
مسیح نے کہا اُٹھ اور وہ شبیرہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ غالباً ان کے ہاتھ میں مسیحائی تھی۔
ان کے مس ہی سے بیمار تندرست اور مردے زندہ ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ بھی کون
کہہ سکتا ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسی تیر بہدف دوا نہ ہو گی جس سے مردے تک
زندہ ہو جائیں۔ ایسی ہی دوا اس سفید ریش سنیاسی نے اُستاد مرحوم کو مرحمت فرمائی
تھی (بیگ سے سنہری گولیوں کی ایک شیشی نکالتا ہے) یہ وُہ تیر بہدف مجرب
دوا ہے (گھنٹی بجا کر) گڑھوال کے پاس اس سفر کی رعایت سے استاد مرحوم
نے اُن کا نام "گڑھوالی گولیاں" رکھا ہے۔ انہی کی وجہ سے استاد خود ۱۰۵ برس

کی عمر تک زندہ رہے اور بڑھاپے میں بھی وہ جوانوں سے زیادہ طاقت رکھتے تھے اور بینائی اُن کی ایسی تیز تھی کہ دس تو کیا بیس فٹ کے فاصلے سے چار رٹ پڑھ سکتے تھے (زور زور سے گھنٹی بجاتا ہے) نہ صرف یہ بلکہ استاد مرحوم نے اس کے اصلی نسخے میں اور ادویہ ملا کر اُسے ہر قسم کی کمزوری کے لئے تیر بہدف بنا دیا ہے۔ کبھی سر میں یا جسم میں چوٹ لگ جائے اور انسان کمزوری محسوس کر رہا ہو غش کی حالت طاری ہو رہی ہو۔ گرم دودھ سے ایک گولی دیجئے۔ فوراً طاقت بحال ہو جائے گی۔ کام کی زیادتی اور غذا کی کمی کے باعث دماغ کمزور ہو گیا ہو نسیان یا بیخوابی کی شکایت ہو، یادداشت کم ہو گئی ہو۔ چیز رکھ کر بھول جاتے ہوں رات کو نیند نہ آتی ہو، پیشانی میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہو۔ اعصابی نظام کمزور ہو گیا ہو سات دن صبح و شام دودھ کے ساتھ ان گرشمائی گولیوں کا استعمال کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ ٹانک مسیحائی اثر رکھتا ہے یا نہیں اور پھر وہ لوگ بچپن یا جوانی میں اپنی لاعلمی یا بیوقوفی سے اپنے جسم کا قیمتی جوہر گنوا بیٹھے ہوں، جنہیں خوبصورتی سے، زندگی سے نفرت ہو گئی جو شرم کے باعث کسی سے اپنا راز نہ کہہ سکتے ہوں۔ کمزوری کا گھن جنہیں اندر ہی اندر بُری طرح کھائے جا رہا ہو۔ اگر ۱۲ دن تک صبح و شام اس ٹانک کا استعمال کریں۔ ان کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑنے لگے گا۔ یہاں تک کہ انہیں ضبط کرنا مشکل ہو جائیگا۔ ان کی سب اُداسی، بے چینی کافور ہو جائے گی۔ زندگی اور اس کی خوبصورتی انہیں پیاری لگنے لگے گی اور جینے کو ان کا جی چاہیگا۔

—— (بیگ سے شیشیاں نکالتے ہوئے) زندگی دینا دام مت لینا۔ استاد مرحوم کہا کرتے تھے۔ میرے پاس اس اکسیر کی صرف چند شیشیاں ہیں جن اصحاب کو ضرورت

ہو ہاتھ کھڑا کریں۔

(بہت سے لوگ ہاتھ اٹھا دیتے ہیں)

—— (ہنستا ہے) آپ سب لوگوں کو ضرورت ہے۔ کاش میرے پاس اتنی شیشیاں ہوتیں۔ آپ لوگوں میں جن کو اشد ضرورت ہو، وہی ہاتھ کھڑا کریں ورنہ کسی کو بھی نہ ملے گی۔

(کچھ ہاتھ گر جاتے ہیں)

—— (ایک نظر اُٹھے ہوئے ہاتھوں پر ڈال کر) نہیں ابھی نہیں مہربانوں میرے پاس بہت کم شیشیاں ہیں جنہیں اشد ضرورت ہو وہی ہاتھ کھڑا رکھیں

(دو چار ہاتھ اور گر جاتے ہیں)

—— حضرات! مجھے استاد مرحوم کا بتایا ہوا گر "آزمانا پڑے گا۔ ضرورت مند کو غیر ضرورت مند سے الگ کرنے کی ترکیب استاد مرحوم نے بتائی ہے (گھنٹی کو ایک بار زور زور سے بجا کر) اس زندگی بخش دوا کی قیمت فی شیشی ایک روپیہ ہے۔ دو ہفتوں کی دوا —— تیس گولیاں اس شیشی میں بند ہیں۔ اب جس شخص کو ضرورت ہو طلب کرے۔

(کچھ ہاتھ گر جاتے ہیں)

—— (ایک نوجوان سے) کیوں بے تیرے پاس روپیہ ہے۔

(کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ ہاتھ نیچے کر لیتا ہے)

—— (باقیوں کو گنتا ہوا) ایک دو تین چار . . . . . دس! اور شیشیاں میرے پاس صرف نو ہیں (چوٹی والے سے) کیوں برہمچاری جی آپ کو کیا ضرورت پڑ گئی۔

چوٹی والا (خفیف ہو کر) میرے ایک مترکو چاہیئے

گھنٹی والا۔ (جیسے اپنے آپ) شیشیاں میرے پاس صرف نو ہیں (مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے) حضرات کان کھول کر سن لیجئے۔ اس شیشی کی قیمت ایک روپیہ ہے جس شخص کے پاس ایک روپیہ ہے۔ وہی ہاتھ کھڑا رکھے۔

(سب ہاتھ کھڑا رکھتے ہیں)

—— استاد مرحوم نے کہا تھا کہ بیٹا زندگی دینا دام نہ لینا۔ یہ ایک روپیہ ان تئیس گولیو کی قیمت نہیں یہ صرف لاگت ہے۔ گڑھوال کے پہاڑوں سے تازہ جڑی بوٹیاں منگا کر یہ دوا تیار ہوتی ہے۔ رفاہِ عام کے لئے اسے محض لاگت پر بانٹا جاتا ہے۔ (ایک بار زور سے گھنٹی بجا کر اور دائرے کا چکر لگا کر) زندگی بخشنے والی ان تئیس گولیوں کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے (ایک لمحہ چپ کھڑا رہتا ہے) میں پھر ایک بار عرض کرتا ہوں کہ اس بار روپیہ واپس نہ کیا جائیگا۔

(کوئی ہاتھ نیچے نہیں گرتا)

—— تو لائیے روپیہ

(روپے اکٹھے کرتا ہے)

—— جن اصحاب نے روپیہ دیا ہے۔ وہ مہربان اپنے ہاتھ کھڑے رکھیں (ترکی ٹوپی والے سے) میاں جی دیکھئے اس بیگ میں اگر ایک شیشی اور ہو (مجمع سے) میں نے اپنے لئے ایک شیشی رکھ چھوڑی تھی۔ لیکن استاد مرحوم کہا کرتے تھے "بیٹا کسی کی زندگی بچتی ہو تو اپنی زندگی کی پروا نہ کرنی چاہئے"۔

(میاں جی شیشی نکال لاتے ہیں اور وہ دسوں شیشیاں بانٹ دیتا ہے)

—— صاحبان میں آپ لوگوں کا بڑا مشکور ہوں کہ آپ نے اتنا وقت مجھ خاکسار کو دیا۔ میری یہی دعا ہے کہ یہ زندگی بخش دوا آپ کو صحت کلی عطا کرے

(بیگ اُٹھا کر چلنے کو ہوتا ہے)

چوٹی والا۔ (شیشی کو ایک بار اِدھر اُدھر سے دیکھ کر) لیکن مجھے تو یہ دوا نہیں....

گریبان والا۔ ارے بھئی وُہ مچھلی.....

گھنٹی والا (جاتے جاتے رُک کر) گو ہماری گولیاں پتھر تک میں جان پیدا کر سکتی ہیں۔ پھر مچھلی تو چیز ہی کیا ہے۔ لیکن مچھلی دودھ کے ساتھ گولیاں نہیں کھا سکتی۔ میاں جی چلئے اسے ہمارے مطب میں لے چلئے۔ وہاں ہم دریا کا پانی منگائیں گے اور انشاء اللہ اس مچھلی کو پھر سے حیاتِ نو بخشیں گے۔

(آگے آگے بیگ اُٹھائے گھنٹی والا، اس کے پیچھے ڈبے کی سی تھامے میاں جی، ان کے پیچھے لوگ چلتے جاتے ہیں)

لمبی چوٹی والا (کرتے کی آستین چڑھاتا ہوا ان کے پیچھے جاتا ہے) میں اس لیڈرے کو مزا چکھا دوں گا، میں.....

(سٹیج پر صرف بزرگ رہ جاتے ہیں۔ کچھ لمحہ وُہ دروازے پر لکھے ہوئے موٹو کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر جیسے اپنے آپ مسکراتے ہوئے)

—— اعتقاد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ معجزے کیا آج نہیں ہو سکتے؟

چلمن

افراد

ہری — منوہر — رادھے
کرن — ششی — روپا
ماں

مقام

(تیس ہزاری دلّی کے ایک مکان میں بیمار کرن کا کمرہ)

وقت

(رات کا پہلا پہر)

(پردہ اُٹھتے وقت سٹیج پر بالکل اندھیرا ہے۔ ماں داخل ہوتی ہے)

ماں۔ یہ تم نے اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔ بتّی کیوں نہیں جلاتے۔

(بجلی کا بٹن دباتی ہے)

[کمرے میں روشنی ہو جاتی ہے۔ ہری، کرن کی چارپائی کے پاس بیٹھا نظر آتا ہے۔ کرن چادر اوڑھے بیہوش پڑی ہے۔ اس کے ٹخنوں میں رسیوں کیساتھ اینٹیں بندھی ہوئی ہیں۔ کمرہ بالکل صاف ہے۔ چارپائی اور چارپائی کے پاس پڑے ہوئے دوائیوں کے میز کے علاوہ کمرے میں اور کچھ سامان نہیں

سامنے کی دیوار میں کھڑکی ہے۔ جس پر گہرے نیلے رنگ کی چلمن لگی ہوئی ہے]

ہری۔ روشنی بجھا دو۔ روشنی بجھا دو۔ کرن کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ تیز روشنی سے وُہ گھبراتی ہے۔ پرسوں سے وُہ دھوپ کی شکایت کر رہی ہے۔

ماں۔ تم تو پاگل ہو۔ اس طرح اندھیرے میں بھوتوں کی طرح بیٹھے ہو۔ اٹھو میں اس کے سرہانے بیٹھتی ہوں۔ تم ذرا اُدھر جا کر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھو۔ تاش......

(دوسرے کمرے سے قہقہوں کی آواز آتی ہے)

ہری۔ میں یہیں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ تم روشنی بجھا دو۔

ماں۔ ششی کرسمس کی چھٹیوں میں آئی ہے۔ وُہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

ہری۔ میں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا ہوں

(دوسرے کمرے سے پھر قہقہوں کی آواز آتی ہے)

— آج اس کی کمزوری بے حد بڑھ گئی ہے۔ یہ گھڑی گھڑی بیہوش ہو جاتی ہے — تم ذرا ان لوگوں سے کہدو اتنے زور سے نہ ہنسیں۔

ماں۔ کون ہنستا ہے۔ ہنسی قہقہے آج چار برس سے اس گھر کے لئے غیر ہو گئے ہیں۔ ہمیشہ موت کا سا سماں چھایا رہتا ہے۔ آج ششی آئی ہے اور اس کے ساتھ منوہر اور یہ بھاری پن ذرا دُور ہوا ہے۔ اُس کی بیماری کا کیا ٹھکانہ ہے اور برس بھر بھی رہ سکتی ہے۔ لیکن وُہ تو خاص طور پر بنارس سے تمہیں دیکھنے آئی ہے۔ ذرا اُن کے ساتھ جا بیٹھو......

ہری۔ میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔ تم روشنی بجھا دو۔ یہ دوپہر سے بیہوش پڑی ہے ہوش میں آئے گی تو روشنی سے گھبرا جائیگی۔

(ماں بتی بجھا دیتی ہے)

ماں۔ یہ لو بابا —— پر بالکل اندھیرے میں بیٹھنے کی بجائے مٹی کا دیا ہی جلا لو۔

(چلی جاتی ہے)

کرن (ہوش میں آ کر) یہ گھُپ اندھیرا کیوں ہے (اور بھی گھبرائی ہوئی آواز میں) یہ گھُپ اندھیرا کیوں ہے۔ میں ..... میں .....

ہری۔ میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔

کرن۔ یہ باہر کچھ نظر کیوں نہیں آتا۔ کیا آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کیا کرشن پکش شروع ہو گیا۔ پر ایک تارا بھی تو آسمان پر نہیں۔

ہری۔ نہیں آج تو پورنماشی ہے۔ کھڑکی پر گہرے نیلے رنگ کی چلمن پڑی ہوئی ہے —— تم بھول گئیں —— تم ہی نے تو کہا تھا —— سورج کی روشنی سیدھی آنکھوں پر آ کر پڑتی ہے۔ یہاں کوئی چق لگوا دو —— آج دوپہر یہ چق بن کر آئی ہے۔ معمولی مارکین نہیں۔ اس پر رنگا ہوا ٹاٹ لگا ہے —— گہرے نیلے رنگ کا۔ روشنی کی کرن تک اس کے اندر نہیں آ سکتی —— پر تم تو سو رہی تھیں کرن

کرن۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا (لمبا سانس لیتی ہے) نہ جانے مجھے کیوں نیند سی آ جاتی ہے۔ بیماری کا مقابلہ کرتے کرتے تھکے ہوئے میرے انگ آپ سے آپ سو جاتے ہیں۔ بیہوش ہو جاتے ہیں۔ پر اس چق کو اب اُٹھا دو۔ میں روشنی چاہتی ہوں .....

ہری۔ میں بتی جلا دوں

کرن۔ نہیں نہیں بجلی کی روشنی سے میرا جی اُلجھتا ہے۔ اس چق ہی کو اُٹھا دو۔ میں روشنی چاہتی ہوں۔ میں ٹھنڈی شانتی بھری روشنی چاہتی ہوں .....

(ہری جا کر چق اُٹھاتا ہے۔ کمرے میں چاند کی روشنی سے مدہم سا اُجیالا پھیل جاتا ہے)

——— ذرا اور اُونچی، ذرا اور اُونچی، پوری اُٹھا دو۔ اس اُجلی چاندنی کو کمرے میں آنے دو۔ من میں آتا ہے ——— چاندنی میں جی بھر کے نہاؤں۔ کرنوں سے مل مل کر اشنان کروں ——— آہ! پر یہ اینٹوں کا بوجھ ——— یہ اینٹیں اب اُتار دو .....

ہری۔ ابھی پرسوں تمہارے پلاسٹر لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹر کہتا ہے .....

کرن۔ آہ ڈاکٹر! (لمبی سانس لیتی ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے ——— جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ گویا میں اسی طرح پڑی ہوں اور میرے پیروں سے اسی طرح اینٹیں بندھی ہیں۔ میں ہل نہیں سکتی۔ بیٹھ نہیں سکتی۔ اُٹھ نہیں سکتی اور کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں کہ اگر آپ یہ رسیاں کاٹ بھی دیں تو کیا میں اُٹھ کر چل پھر سکوں گی ——— ٹانگیں شاید چلنا بھول گئی ہوں (لمبا سانس لیتی ہے) اس چاندنی رات میں گھومنے کو کتنا جی چاہتا ہے۔

(دوسرے کمرے سے پھر قہقہوں کی آواز آتی ہے)

کرن۔ یہ کون ہے؟

ہری۔ منوہر آیا ہے۔ شاید لوگ برج کھیل رہے ہیں۔

کرن۔ مجھے برج کھیلے برسوں بیت گئے ہیں۔ میں کتنا برج کھیلتی تھی۔ بازی پر بازی جیتا کرتی تھی ——— میں برج کھیلنا چاہتی ہوں۔ کیا وہ اس کمرے میں نہیں آسکتے

ہری۔ تم بہت کمزور ہو کرن .....

کرن۔ انہیں کہہ دو ——— اس کمرے میں بیٹھ کر کھیلیں۔ میں صرف دیکھوں گی ....

ہری - تم بہت کمزور ہو کرن - ڈاکٹر کہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

کرن - آہ ڈاکٹر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(دوسرے کمرے سے پھر قہقہوں کی آواز آتی ہے)

ہری (چڑ کر) یہ لوگ خاموش کیوں نہیں ہو جاتے - میں کتنی بار کہہ چکا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

کرن - تم انہیں کچھ نہ کہو - میری وجہ سے پہلے ہی گھر میں کافی اُداسی چھائی رہتی ہے - کوئی ہنستا کھیلتا نہیں - جاؤ تم بھی جاؤ - ان کے ساتھ جا کر من بہلاؤ - میرا دل تمہارے ساتھ ہو گا میری آنکھیں تمہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پر میری آنکھیں تو بند ہو رہی ہیں - وہ طاقت کی دوائی کہاں ہے - مجھے اس نیند سے ڈر لگتا ہے مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہری (میز کی شیشیوں میں ڈھونڈھتا ہوا) دوا کہاں ہے (اٹھ کر پھر ڈھونڈھتا ہے) وہ طاقت کی دوا کہاں ہے؟ ماں وہ طاقت کی دوا کہاں ہے؟

(ماں دیا لئے داخل ہوتی ہے)

ماں - کیا بات ہے؟

ہری - طاقت کی دوا کہاں ہے ماں؟ کرن پھر بیہوش ہو گئی ہے -

ماں - اس اندھیرے میں تمہیں کیا ملیگی - یہ لو میں دیا لے آئی ہوں - بالکل اندھیرا ٹھیک نہیں - اندھیرا منحوس ہے - اندھیرا ۔ ۔ ۔ ۔

ہری - باہر چاند جو چمک رہا ہے -

ماں - لیکن کمرے میں تو اندھیرا ہے - بجلی نہیں جلانا چاہتے تو اسے طاق میں پڑا جلنے دو -

(دیا طاق میں رکھ دیتی ہے - وہیں دوائی کی شیشی پڑی مل جاتی ہے - اُسے

اُٹھا لیتی ہے)

—— اور یہ تو ششی۔ یہی شاید طاقت کی دوا ہے لیکن میری مانو تو اب اسے آرام کرنے دو۔ ان دوائیوں، پلاسٹروں .....

ہری۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں تو چپ رہو ماں۔ ان سے کہدو۔ اتنا گلا نہ پھاڑیں۔

ماں۔ مَیں نے اُنہیں پہلے ہی تمہارے ڈر سے دوسرے کمرے میں بھیجدیا ہے۔

ہری۔ (جیسے اپنے آپ) اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ یہ بار بار بیہوش ہو جاتی ہے

(دوائی چمچے میں ڈال کر اس کے مُنہ میں ٹپکاتا ہے)

—— سب گالوں پر بہہ گئی۔ ماں تم ذرا چمچہ تھامو۔ میں دانت کھولتا ہوں۔

[ماں چمچہ لیکر بھرتی ہے۔ ہری دانت کھول کر پھر دوائی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے]

—— بیکار ہے۔ بہہ جاتی ہے۔ بُہت کم دوا اندر گئی ہے

ماں۔ لو اب آؤ۔ تم کب سے یہاں اس طرح بیٹھے ہو۔ اب اُٹھو، میں یہاں بیٹھتی ہوں۔ تم ادھر جا کر ذرا کمر سیدھی کر لو۔ ذرا ان کے ساتھ جا کر جی بہلا لو۔ ذرا ان کا جی رکھ لو .....

ہری۔ میں نے ایک بار کہدیا۔ میں نہیں جا سکتا

ماں۔ ششی نہ ٹھیک طرح سے کھیل رہی ہے نہ .....

ہری۔ تو میں کیا کروں۔ منوہر خود یہاں ہے .....

(بیہوشی سے جاگ کر کرن دایاں ہاتھ ہلاتی ہے)

—— کرن .....

کرن (جیسے خوابوں کی دنیا سے آنے والی ڈری ڈری آواز میں) روشنی ——— میں روشنی چاہتی ہوں۔ میں روشنی چاہتی ہوں۔ میں اندھیرا نہیں چاہتی (آنکھیں کھلتی ہے۔ میری چارپائی اس کھڑکی کے پاس روشنی میں کر دو۔ میں ذرا باہر جھانکنا چاہتی ہوں (لمبی سانس لیتی ہے) معلوم ہوتا ہے۔ باہر کی سب چیزیں میرے لئے اجنبی ہو گئی ہیں لیکن وہ سب مجھے سپنوں میں بار بار آتی ہیں (قدرے مسرور ہو کر) ابھی میں نے اپنے آپ کو اجیت گڑھ کے اس مینار پر چڑھے دیکھا تھا۔

ہری (طاقت کی دوا چمچے میں ڈالتا ہوا) اجیت گڑھ کے مینار پر۔

کرن۔ میں نے دیکھا ——— یہ ساری کی ساری راجدھانی میرے پیروں میں بچھی ہوتی ہے اور سورج کی دھوپ میں نئے مکانوں کی نئی نئی چھتیں چمک رہی ہیں۔

ہری (دوائی کی شیشی کو میز پر رکھتا ہوا بدستور بے خیالی میں) سورج تو کب کا چھپ چکا

کرن۔ ہاں سورج کب کا چھپ چکا ہے (اداس ہو کر) شاید میں اب اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ اس مینار سے نئے بنے ہوئے مکانوں کی نئی نئی چھتوں کو کبھی نہ دیکھ سکونگی

ہری۔ (اس کے حلق میں دوائی ٹپکاتا ہوا) تم برسوں تک دیکھو گی کرن۔ اپنی ان آنکھوں سے، میری ان آنکھوں سے برسوں تک دیکھو گی۔

کرن (دوا سے کچھ طاقت پا کر قدرے اونچی اور جذبات سے بھری آواز میں) آپ کو وہ صبح یاد ہے۔ جب رات بھر بارش ہوتی رہی تھی ——— بھیگی بھیگی، بھاری بھاری سی ہوا چل رہی تھی اور میں نے آپ کو سیر پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا تھا ہم برج پر گئے تھے اور پیر غائب کے مزار پر چڑھے تھے۔

ہری۔ مجھے سب یاد ہے۔ پر تم زیادہ نہ بولو کرن۔ تم تھک جاؤ گی۔

کرن۔ نہیں میں چپ نہیں رہنا چاہتی۔ خاموشی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں بولنا چاہتی ہوں۔ میں ہنسنا چاہتی ہوں۔ میں کھیلنا چاہتی ہوں۔

ہری۔ تم زیادہ نہ بولو کرن۔ تم آرام کرو۔ تم ۔۔۔۔

کرن۔ میں آرام ہی تو کرتی رہتی ہوں

ہری۔ تمہارا جسم ضرور آرام کرتا ہے لیکن تمہارا من ہمیشہ اڑتا رہتا ہے۔

کرن (لمبا سانس لیتی ہے) ہاں میرا من ہمیشہ اڑتا رہتا ہے اور ابھی ابھی وہ اڑ کر اس مزار کے کھنڈر پر جا چڑھا تھا ـــــ یاد ہے نہ آپکو ـــــ ٹھنڈی بھیگی مست ہوا چل رہی تھی اور نیچے بارش میں بھیگی ہوئی سڑکیں پگھلی ہوئی چمکتی چاندی کی طرح بل کھاتیں، درختوں کے پتوں میں جھلملاتی تھیں مجھے اس بڈھے کی شکل یاد آتی ہے۔

ہری (اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بے خودی میں) بڈھے کی ۔۔۔۔

کرن۔ وہ نیچے سیڑھیوں سے اوپر کو آنے لگا تھا کہ میں اترنے لگی ـــــ کھچڑی سی ڈاڑھی، ملیالے کپڑے، سر پر پگڑی اور کمر میں تہمد ـــــ وہیں نیچے کھڑا بہت دیر تک مجھے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ پھر جب اس نے دوسری سیڑھیوں پر آپ کو بھی اترتے دیکھا تو یکدم نیچے اتر گیا (آہستہ آہستہ خواب آلودہ سی آواز میں) اور جب ہم نے دھرتی پر پاؤں رکھا تھا تو آگے بڑھ کر گڑگڑایا تھا ـــــ جوڑی سلامت رہے بھو کا ہوں۔

ہری۔ بھوکا تھا اور ندیدا۔

کرن (اور بھی خواب آلود آواز میں) ـــــ میں دیکھتی ہوں۔ وہی بڈھا میرے

سینوں میں بھیانک روپ دھار دھار کر آتا ہے۔ میں ہمیشہ دیکھتی ہوں ——
اس کے پیٹ میں ایک بھٹی دھک رہی ہے اور میں اور میرے جیسی کئی اس
جلتی ہوئی بھٹی کا ایندھن بن رہی ہیں۔

ہری۔ تم اپنے دماغ کو تھکا رہی ہو کرن!

کرن (جھرجھری سی لیکر بیدار ہوتی ہوئی) مجھے پھر نیند آ رہی ہے۔ میری آنکھوں میں
اندھیرا چھا رہا ہے —— نہیں نہیں مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ میری
چارپائی روشنی میں کر دو۔

ہری۔ تم سو جاؤ کرن۔ تم اپنے کو ....

کرن (جاگنے کی کوشش کرتے ہوئے) میں سونا نہیں چاہتی۔ میں جاگنا چاہتی ہوں
(لمبی سانس لے کر اور بھی خواب آلود آواز میں) پر میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں میری
آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے۔ مجھے دوا پلا دو۔ میری چارپائی روشنی ....

(خاموش ہو جاتی ہے)

ہری (دوا کا چمچہ بھر کر اس کے منہ کی طرف لے جاتا ہوا) کرن ... کرن ....

(بہن داخل ہوتی ہے)

بہن۔ تم دوپہر سے ادھر بیٹھے ہو۔ چلو اُدھر چلو۔

ہری (دوا کو پھر شیشی میں ڈالتا ہوا) یہ بیہوش ہو گئی ہے۔

بہن۔ ماں کو بھابی کے پاس بیٹھنے دو۔ تم ذرا چلو۔ شَشی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہے
وُہ دل سے کھیل میں حصّہ نہیں لے رہی۔ بے دلی ....

ہری (سُنی اَن سُنی کر کے) رُوپا تم ذرا چارپائی کو اس کھڑکی کے پاس کرنے میں

میری مدد کرو۔ یہاں اندھیرا ہے اور دیئے کی کانپتی ہوئی روشنی اُس تک نہیں پہنچتی

(دونوں چارپائی اُٹھاتے ہیں)

—— آہستہ! اینٹوں کے ہلنے سے اسے تکلیف نہ ہو (کھڑکی کے پاس چارپائی لیجاتے ہوئے) اس اندھیرے میں اس کی کمزور صورت اور بھی کمزور نظر آتی ہے۔

بہن۔ اب اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ کبھی آسودہ نہ ہونیوالی جونک کی طرح اس موذی بیماری نے اس کا خون چوس لیا ہے۔ تم خواہ مخواہ اس کی بیماری کو طول دیئے جاتے ہوتے ہو ناحق دن دن بھر پریشان بیٹھے رہتے ہو۔ ذرا اپنی صورت تو دیکھو۔ تمہارا چہرہ کتنا پیلا پڑ گیا ہے۔

ہری۔ تم اس کا مُنہ دیکھو —— پیلا بھی نہیں سفید ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ساری چاندنی اس کے جسم سے نکل کر کائنات پر پھیل گئی ہے اور اپنی سب حرت لٹا کر یہ جسم مرجھا گیا ہے۔

بہن۔ تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ اٹھو، ماں کو یہاں بیٹھنے دو۔ چل کر کچھ دیر کے لئے ششی کے پاس بیٹھو۔ بنارس سے وُہ صرف تم سے ملنے وہاں چلی آئی ہے۔ تم کیسے پتھر ہو۔

ہری۔ اس چادر سے اُس کے پاؤں ڈھانپ دو۔ ننگے ہو گئے ہیں۔

بہن۔ نہ جانے کب تک تم اس نیم جاں پنجر کے سرہانے بیٹھے رہو گے۔

ہری۔ نہ جانے کب تک میں اس نیم جاں پنجر کے سرہانے بیٹھا رہوں گا —— اپنی سُونی گھڑیوں میں اپنے سپنوں، اپنی تنہائیوں میں —— میں خود ایک نیم جاں پنجر بن جاؤنگا

بہن (بھرے ہوئے گلے سے) تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہیں دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے۔

(کرن ہاتھ ہلاتی ہے)

ہری۔ ٹھہرو، یہ ہوش میں آ رہی ہے۔

کرن (ہوش میں آ کر ڈری ڈری آواز میں) نہیں نہیں میں اندھیرا نہیں چاہتی۔ میں روشنی چاہتی ہوں۔ میری چارپائی روشنی میں کر دو۔

ہری۔ تم آنکھیں کھولو۔ دیکھو تمہاری چارپائی پر نور پھیلا ہوا ہے۔ باہر سڑک پر، پہاڑی کے پتھروں پر، چٹانوں پر، درختوں پر نور پھیلا ہوا ہے۔

کرن۔ اوہ، میں کتنا ڈر گئی ہوں

(آنکھیں کھول کر سکھ کا سانس لیتی ہے)

ہری (چمچہ میں دوا ڈال کر اس کی طرف بڑھاتا ہے) تم یہ دوا پی لو۔

کرن (دوا پی کر پھر سکھ کا سانس لیتی ہے) میں کتنا ڈر گئی ہوں (خواب آلود آواز میں) ابھی ابھی میں دیکھ رہی تھی ——— میں اس جنگل میں بھٹک گئی ہوں، پتھروں سے ٹھوکریں کھاتی اور جھاڑیوں سے اُلجھتی ہوئی اندھیرے میں راستہ ڈھونڈ رہی ہوں ——— میں چلی جا رہی ہوں۔ اُلجھتی ہوئی، گرتی ہوئی، بھٹکتی ہوئی بڑھی چلی جا رہی ہوں ——— سامنے بھیانک کالا پہاڑ آ جاتا ہے۔ اس پر چڑھنے لگتی ہوں۔ سانس پھول جاتا ہے۔ ٹانگیں چلنے سے جواب دے دیتی ہیں۔ پاؤں میں زخم ہو جاتے ہیں لیکن میں بڑھے چلی جاتی ہوں، بڑھے چلی جاتی ہوں۔ روتی ہوں، پر چلنا نہیں چھوڑتی (قدرے مسرور ہو کر) اور میں چوٹی پر جا چڑھتی ہوں ——— دیکھتی ہوں ——— سامنے پورب کی آنکھوں میں روشنی جاگ رہی ہے اور نیلی بھوری بدلی کے پیچھے سے سورج کی سنہری ٹکیا نکل رہی ہے۔

(ماں داخل ہوتی ہے)

ہری۔ سُورج کی ٹکیا......

کرن۔ مَیں سہمی ہوئی سی کھڑی رہ جاتی ہوں لیکن میری نس نس میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے (لمبی سانس بھرتی ہے) مجھے روشنی کتنی اچھی لگتی ہے مجھے بیداری....

ماں (آگے بڑھ کر) فشتی جانا چاہتی ہے۔

ہری۔ ٹھہرو (کرن سے) تم نے پہاڑ سر کر لیا ہے (ماں اور بہن دونوں کو سُنا کر) ماں کرن نے پہاڑ سر کر لیا ہے، روپا کرن نے پہاڑ سر کر لیا ہے (پھر کرن سے) اس لمبی بیماری کی تکلیفوں اور اذیتوں کو تم کامیابی سے برداشت کر آئی ہو (سکھ کی سانس لیتا ہے) کرن تمہارا یہ خواب کتنا خوش کُن ہے کتنا تسکین دینے والا ہے —— اور دیکھو تم روشنی میں ہو —— کتنی صاف اور کتنی دھلی ہوئی روشنی ہے۔ سامنے مندر کی دیواریں اس پورنماشی کے چاند کی پاکیزہ روشنی میں کسی سورگ کے مندر کی یاد دلا رہی ہے

کرن۔ مجھے سہارا دیکر بٹھا دو۔ میں کھڑکی سے مندر کو دیکھنا چاہتی ہوں کتنی بار اپنے سپنوں میں اس کے دروازوں سے سر پٹکتی رہی ہوں۔ اس کے اندر جانے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ نہ جانے اس کے اندر جا بھی سکونگی یا نہیں۔

ہری۔ تم ضرور جاؤ گی تم نے اس تاریک اور بھیانک جنگل میں راستہ بنا لیا تو کیا تم اس مندر کی دیواروں کو پار نہ کر سکو گی تم ضرور اس مندر کے اندر جاؤ گی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ جائیں گے

کرن۔ مجھے سہارا دیکر بٹھا دو۔ میں ان پہاڑیوں کو دیکھ لوں۔ اس مندر کو دیکھ لوں۔

ہری۔ ابھی پرسوں تمہارے ناسور پر پلاسٹر لگایا گیا ہے۔

(منوہر تیز تیز داخل ہوتا ہے۔ لیکن پاس آکر چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے)

کرن۔ مَیں محسوس کرتی ہوں جیسے میرے ناسور کو آرام آ رہا ہے مجھے بٹھا نہیں سکتے تو میری چارپائی کے نیچے سرہانے کی طرف اینٹیں ہی رکھ دو (جیسے خواب میں باتیں

کر رہی ہو) چارپائی کھڑکی جتنی اُونچی ہو جائیگی اور میں لیٹے لیٹے سب کچھ دیکھ سکونگی (لمبا سانس لے کر اور بھی دھیمی اور خواب آلود آواز میں) نہ جانے کیوں آج میرا جی باہر جانے کو، پہاڑی کے پیڑوں میں گھومنے کو، مینار پر جا چڑھنے کو بےچین ہو رہا ہے۔

(آنکھیں بند کر لیتی ہے)

ہری۔ تمہارے ناسور کو آرام آ رہا ہے.....

منوہر۔ خاک آ رہا ہے۔ تم دیکھ نہیں رہے وُہ بیہوش ہو گئی ہے۔ تم کیوں اس کو، اپنے آپ کو، دوسروں کو فریب میں مبتلا رکھے ہوئے ہو۔ تم کہتے ہو ناسور بھر رہا ہے۔ میں کہتا ہوں —— اس کا سارا جسم ناسور بن گیا ہے۔ یہ اب کبھی نہ بھرے گا۔ چار سال —— چار لمبے سال —— خیال ہی سے میری رُوح کانپ جاتی ہے اور یہ چارپائی سے ہلی تک نہیں۔ آہستہ آہستہ اس کا بھرا ہوا جسم کمزور ہوتا ہوتا ہڈیوں کا پنجر رہ گیا۔ اس کی ٹانگیں سُوکھتے سُوکھتے لکڑی ہو کر رہ گئیں اور تم نے یہ اینٹیں پھر اس کے ٹخنوں سے باندھ دی ہیں.....

ہری (بہن سے) رُوپا ذرا باہر سے دو چار بڑی اینٹیں اُٹھا لا۔

منوہر۔ اب ان ڈاکٹروں اور پلاسٹروں سے اس کو نجات دو۔ اس کے ٹخنوں سے یہ بوجھ کاٹ دو۔ اسے آخری گھڑیوں میں تو آرام لینے دو —— تم کتنے بیدرد ہو کہ اس کی اس بیماری سے بھی لطف لیتے ہو۔

ہری۔ منوہر ——

منوہر۔ یہ عیاشی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم اس سوز میں رس لیتے ہو۔ اس سے انسپریشن INSPIRATION حاصل کر کے پُرسوز شعر کہتے ہو اور پھر انہی کے سوز میں گم رہتے ہو

ہری۔ منوہر ——

منوہر۔ اور دُنیا کی نظروں میں تم اپنی بیمار دم توڑتی ہوئی بیوی کے سرہانے بیٹھے، درد و غم میں چُور رہتے ہو لیکن درحقیقت ایک چالاک جادوگر کی طرح تم اپنے پرسوز شعروں کا جال ششی کے ارد گرد بنتے جا رہے ہو۔

ہری۔ منوہر تم پاگل ہو گئے ہو۔

منوہر۔ میں چار سال سے دیکھ رہا ہوں کسی دوسرے کے گھر میں یہ اب تک کب کی ختم ہو چکی ہوتی —— ریڑھ کی ہڈی کا ناقابلِ علاج ناسور، لیکن تم نے اس کو اتنا کھینچا اتنا کھینچا —— انجکشن دے دیکر، پلاسٹر لگوا لگوا کر، اینٹیں باندھ باندھکر —— اور اس بیماری سے تم اپنی پرسوز نظموں کی غذا حاصل کرتے رہے۔

(رُوپا اینٹیں لے آتی ہے)

ہری۔ اینٹیں ادھر دو۔

(اس سے اینٹیں لے کر پاؤں کے نیچے رکھتا ہے)

منوہر۔ تم اسکی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ تم ششی کی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے تم میری تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے —— یہ اینٹیں اس کے پاؤں میں نہیں ششی کے پاؤں میں بھی بندھی ہیں اور میرے پاؤں میں بھی۔ یہ سوئیاں اس کو ہی نہیں چبھتیں، اُس کو بھی چبھتی ہیں اور میرے دل میں بھی کچوکے لگاتی ہیں۔ یہی سوکھ کر کانٹا نہیں ہو رہی وہ بھی ہو رہی ہے اور میں بھی —— تم نے اس کے جسم کا بیمار خون اپنی نظموں کے ذریعے ......

ہری۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔ حسد اور رقابت نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔

منوہر۔ تم نے یہ جال اس چالاکی سے بُنا ہے کہ ششی اس میں پھڑ پھڑاتی رہے گی نکل نہ سکے گی۔

ہری۔ منوہر ——

منوہر۔ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

ہری۔ تم دیکھتے نہیں کرن کی حالت خراب ہے وُہ مرنے کو ہے اور تم اپنی ان زہر سے بُجھی ہوئی باتوں سے میرا دل چھلنی کرنے آئے ہو۔

منوہر۔ تم ششی کو نہ اپناتے ہو نہ چھوڑتے ہو اور مَیں ترشنکو[1] کی طرح بیچ میں ہی لٹکا ہوا ہوں میں جانتا ہوں۔ تمہاری اس بے پروائی میں کتنی غرض چھپی ہوئی ہے —— واہ رے بے نیازی۔ وُہ بنارس سے تم سے ملنے کے لئے آئی ہے۔ کھیل میں وہ حصّہ نہیں لے سکی۔ باتوں میں وُہ حصّہ نہیں لے سکی اور تم اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں

ہری۔ کرن کی حالت بحد خراب ہے۔ زندگی اور موت ۔ ۔ ۔ ۔

منوہر۔ وُہ پھڑ پھڑاتی رہیگی۔ نہ جئے گی۔ نہ مریگی۔ کرن کے سوکھتے بیمار جسم کا لہو اپنی نظموں کے ذریعے تم نے ششی کے جسم میں ڈال دیا ہے۔

(کرن ہاتھ ہلاتی ہے)

ہری۔ جاؤ، تم سب چلے جاؤ۔ کرن ہوش میں آرہی ہے۔

کرن ۔ (نہایت خواب آلود آواز میں) میں چلمن نہیں چاہتی۔ میں چلمن نہیں چاہتی میری روشنی بند نہ کرو۔ میری ۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] ترشنکو ایک شہنشاہ راجہ تھا رشی وشوامتر کی اس نے اتنی خدمت کی کہ انہوں نے اسے مرے بغیر سورگ میں جانے کا وردان دیا۔ جب وُہ سورگ کی طرف روانہ ہوا تو اندر نے اسے سورگ میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ نیچے سے وشوامتر نے کہا "اوپر جاؤ" اوپر سے اندر نے کہا "نیچے جاؤ" اور ترشنکو درمیان ہی میں لٹک گیا۔

ہری۔(اس کے منہ میں دوا ٹپکاتا ہوا) کون تمہاری روشنی بند کرتا ہے۔یہ دیکھو چلمن اٹھی ہوئی ہے اور چاند کی پاکیزہ روشنی تمہارے ساتھ کھیل رہی ہے۔میں نے تمہاری چارپائی کے نیچے اینٹیں رکھ دی ہیں۔اٹھو۔دیکھو.....

ماں۔یہ نہ اٹھیگی۔دیکھتے نہیں۔اس کے ہاتھ مڑ رہے ہیں۔اسے دھرتی پر اتار لو

ہری۔نہیں میں اسے دھرتی پر نہ لٹانے دوں گا ـــــ ٹھنڈی، بیرحم، بےحس، دھرتی پر...

کرن۔میری روشنی بند نہ کرو۔میری روشنی بند نہ کرو....

ہری۔کون تمہاری روشنی بند کرتا ہے

کرن۔ششی میری روشنی بند کر رہی ہے:

ہری۔ششی ـــــ

(چلمن آپ سے آپ گر پڑتی ہے)

کرن۔وہ میری روشنی بند کرنے کیلئے گہرا نیلا ٹاٹ رنگ رہی ہے۔میں چلمن نہیں چاہتی میری روشنی بند نہ کرو۔میری....

ہری(چلمن اٹھا کر پھینک دیتا ہے)میں نے چلمن اتار دی ہے۔کرن...کرن....

ماں۔کرن کہاں۔کرن ختم ہو گئی ہے۔میں نے کہا تھا۔دھرتی پر اتار...

رادھے۔ششی نے پوچھا ہے ـــــ میں نہیں آسکتی ہوں۔

ہری۔وہ نہیں آسکتی۔وہ کبھی نہیں آسکتی۔دیکھتے نہیں میں نے چلمن اتار دی ہے۔میں نے چلمن اتار کر پھینک دی ہے....کرن...کرن....

(پردہ گرتا ہے)

کھڑکی

افراد

کندن سنگھ	نینا
پارو	کاسنی
لاجو	نہری

[پردہ اُٹھنے سے پہلے دُور سے لڑکیوں کے گانے کی آواز آتی ہے جو آہستہ آہستہ نزدیک ہوتی جاتی ہے]

پوجن چلو بسنت، سکھی ری آج
پھاگن آیا رنگیلا بھر یا ہے سکھی
سرسوں پھولی ری، سکھی ری آج
گھر گھر منگلا چار ہے دان سنگھ
پھاگن آیا رنگیلا بھریا

(گانے کی آواز پاس آکر بالکل بند ہو جاتی ہے اور لڑکیاں آوازیں دیتی ہیں)

ایک آواز۔ نینا او ری نینا

دوسری آواز۔ یہاں کھڑکی میں کیا چُپ چاپ بیٹھی ہو۔ چلو بسنت پوجنے چلیں

تیسری آواز۔ یہ سر کیا ہلاتی ہو؟ ہم خود تمہیں اوپر آکر گھسیٹ لے چلیں گے۔

(اس کے ساتھ ہی پردہ اُٹھتا ہے۔ نینا دائیں طرف کھڑکی میں بیٹھی باہر کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اُس نے سیدھے سادے سے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اُس کی بسنتی چنری سامنے کی دیوار میں کھونٹی پر لٹک رہی ہے۔ کمرے میں چرخے، پیڑھے وغیرہ دیہاتی ضرورت کا سامان رکھا ہے۔ پردہ اُٹھنے کے ساتھ ہی بائیں دیوار کے دروازے سے لاجو، پارو اور کاسنی داخل ہوتی ہیں اور اُس کو گھیر لیتی ہیں)

پارو (اُسے کندھے سے ہلاتے ہوئے) نینا چلو نا۔

لاجو۔ چلو بھی نینا۔

کاسنی۔ اب اُٹھو بھی۔ ہمارا تو گلا بھی بیٹھ گیا تمہیں آوازیں دیتے دیتے۔

نینا۔ مجھے یہیں بیٹھا رہنے دو۔

پارو۔ دیکھو سامنے میدان میں سب چرواہے اپنے ڈھور ڈنگر لیکر پہنچ گئے ہیں۔۔۔

کاسنی۔ ان کے ماتا پتا ہاتھوں میں پانچ پانچ اُپلے لئے وہاں جا رہے ہیں —— پیلے صافے اور بسنتی چنریاں —— معلوم ہوتا ہے جیسے بسنتی ندی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی بہ رہی ہے۔

لاجو۔ کیا تمہاری چُنری اِس ندی کی لہر نہ بنے گی —— ارے تم نے تو بسنتی چنری بھی نہیں پہنی۔

پارو۔ یہ کیا بد شگونی ہے۔ اُٹھو کھڑکی بند کرو، بسنتی چنری پہنو اور بسنت اُپج کے لئے چلو۔

نینا۔ میری چُنری وُہ کھونٹی پر لٹک رہی ہے اور میری کھڑکی کھُلی ہے (لمبا سانس لیکر) یہ چار سال سے کھُلی ہے اور نہ جانے کب تک کھُلی رہیگی۔

پارو۔ تم کیسی باتیں کرتی ہو۔

لاجو۔ ہم سب تمہیں لے جا کر رہیں گی۔

پارو۔ اُٹھو نینا۔ کہیں سال کے بعد تو یہ تہوار آتا ہے۔ فکر اور غم تو سال بھر رہتے ہیں یہی ایک دن تو آتا ہے ہنسنے ہنسانے کا۔

نینا۔ بس اسی دن آنسو۔۔۔۔

(باہر سے آواز آتی ہے)

نینا، نینا، لاجو۔۔۔۔

لاجو۔ اُٹھو نینا، وُہ دیکھو سب شور مچا رہی ہیں اور تم چُپ چاپ بیٹھی ہو۔

نینا۔ مجھے نہ چھیڑو۔ مجھے چپ چاپ یہیں بیٹھا رہنے دو۔ جسم کے ساتھ نہ ہوئی تو کیا ان آنکھوں سے میں تمہارے ساتھ ہونگی

(باہر سے آواز آتی ہے)

لاجو!

لاجو۔ مَیں تو چلی، تم آؤ کاسنی جلدی۔

پارو۔ اُٹھو بھی نینا کیا ہو گیا تمہیں۔

نینا۔ جو پچھلے سال ہوا تھا۔

کاسنی (ہنسکر) اور جو اس سے پچھلے سال ہوا تھا۔

پارو۔ آخر تم کب تک اس کا انتظار کرتی رہو گی۔ یہ چوتھا سال ہے اور ان چار

برسوں سے تم نے اس تہوار میں حصّہ نہیں لیا ___ کیسا دل پتھر ہو گیا تمہارا۔
نینا۔ میرے دل میں اُترو تو جانو ___ وہ پتھر ہے یا پانی۔

(باہر نیچے سے آواز آتی ہے)

کاسنی!

کاسنی۔ وہ سب بیچین ہو رہی ہیں۔ اُٹھو نینا

(باہر نیچے سے آواز آتی ہے)

تم آتی ہو تو آؤ۔ ہم تو جا رہی ہیں۔

(عقب میں گانے کی آواز پھر شروع ہو جاتی ہے جو آہستہ آہستہ دُور ہوتی جاتی ہے)

پُوجن چلو بسنت سکھی ری آج

کاسنی۔ مَیں تو چلی، تم اسے لیکر آؤ پارو۔

(گانے کی آواز اُونچی ہو جاتی ہے اور لحظہ بہ لحظہ دُور ہوتی جاتی ہے)

پھاگن آیا رنگیہ بھر یا ہے سکھی
سرسوں پھُولی ری۔
پیا سنگ کھیلو گلال، مدن سنگھ
پھاگن آیا رنگیہ بھر یا۔

پارو۔ نہیں نینا یہ ٹھیک نہیں۔ اس طرح تو زندگی نہیں بتائی جا سکتی۔
نینا (بیخودی میں) کس طرح نہیں بتائی جا سکتی۔
پارو۔ نہ جانے وہ کہاں ہو گا، کیسے ہو گا؟ اور اس بات ہی کا کیا بھروسا ہے کہ وہ

اب تک تمہارے ہی نام کی مالا جپتا ہوگا۔

نیلنا۔ میں بدن سنگھ کو جانتی ہوں۔ وہ بھنورا نہیں، پتنگا ہے ——— پنکھ چاہے جلا لے . . .

پارو۔ پتنگے کیا جوت جوت نہیں اڑتے۔ تم تو پاگل ہو۔ کندن سنگھ . . . . .

نیلنا۔ (غم سے ہنستی ہے) پتنگے چاہے کسی اور سے لو لگا لیں پارو۔ پر لو تو کہیں نہیں جاتی، جلتی ہی رہتی ہے۔

پارو۔ باپو اس کی سگائی باندنوں میں کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ کان ہی نہیں دیتا۔

(نیلنا چپ رہتی ہے)

——— بدن سنگھ کا کیا ٹھکانہ ہے نیلنا۔ اتنے برس ہو گئے اس کی کوئی کھوج خبر نہیں ملی۔ جانے کہاں ہیں، جانے کیسے ہیں؟ اور کندن سنگھ . . .

نیلنا۔ وہ آئے گا پارو۔ جس دن باپو نے اسے ڈانٹا تھا اور اس نے پوپا نگر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا، اس دن وہ مجھے اس کھڑکی کے نیچے ملا تھا۔ مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے، بسنت اُتسو ختم ہو چکا تھا۔ پورب کی طرف نیلے نیلے بادل اٹھ آئے تھے اور سورج کی ڈوبتی ہوئی کرنوں نے ان کی کوروں کو رنگ دیا تھا۔ تیز ہوا چلنے لگی تھی اور راستوں میں بکھری ہوئی سرسوں کے پھولوں کی مرجھائی پتیاں ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے چہرے پر لوہے کے سے ارادے کی سختی تھی۔ نیلنا میں آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔ میں تمہارے لائق ہو کر آؤں گا۔

پارو۔ اور کندن کے من میں بھی تو یہی بات سما گئی ہے ——— وہ بھی تو تمہارے لائق ہو جانا چاہتا ہے۔ تمہارے لئے اس نے کیا نہیں کیا؟ تمہارے لئے وہ کیا نہیں کر سکتا؟ کہیں تمہارا نام آئے تو اس کا چہرہ کھل جاتا ہے۔ کوئی تمہاری برائی سے

تو اُس پر برس پڑتا ہے۔ تمہارے کام کی، تمہاری قوت کی، تمہاری محنت و مشقت کی تعریف کرتے اُس کی زبان نہیں تھکتی۔ بھاوجیں سو سو باتیں بناتی ہیں لیکن وُہ ہمیشہ تمہاری صفائی دیتا ہے "اُس جیسی کوئی بن کر تو آئے"۔ وُہ کہا کرتا ہے۔ "آج چار برس بدن بھائی کو باہر گئے ہو گئے ہیں۔ وُہ اس کے نام کی مالا جپ رہی ہے۔ اسے کس بات کی کمی ہے۔ اناج سے اُس کے کھلیان بھرے ہیں۔ روپے پیسے سے اس کی تجوریاں بھری ہیں ــــ وُہ اشارہ کرے تو بیسیوں گبرو اس کے قدموں پر نثار ہو جائیں۔ لیکن وُہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی"۔ سچ نینا تمہاری تعریف کرتے اُس کی آنکھوں میں جیسے چمک آ جاتی ہے۔ مجھے تو اُس پر ترس آیا کرتا ہے۔

(نینا خاموش رہتی ہے)

پارو۔ اور باندنوں والوں کی بات پر اُس کے آگ لگ جاتی ہے ــــ وُہ شریف اور بھلے آدمی ہیں۔ چار مربعے زمین ہے اُن کی اور پھر گھر میں سب کو آنندی پسند ہے۔ لیکن وُہ تو تمہاری طرف آس لگائے بیٹھا ہے۔ جب تک یہ آسا نہیں ٹوٹتی۔ وُہ کسی دوسری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

(نینا چپ رہتی ہے)

پارو۔ تم اُسے کورا جواب بھی تو نہیں دیتیں۔ آخر اُسے کچھ آسا ہو گی ہی ــــ میری بات کا بُرا نہ ماننا نینا، یا اُسے اپنا لو یا جواب دے دو ــــ کورا جواب دے دو۔ وُہ میرا بھائی ہے۔ لیکن میں یہ کورا جواب پسند کر لوں گی۔

نینا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ میں اُسے ہمیشہ بھائی کی طرح مانتی آئی ہوں۔ بدن سنگھ کے جانے کے بعد وُہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ آیا ہے۔ لیکن میں بدن سنگھ کا

خیال نہیں چھوڑ سکی اور تم میری اتنی اچھی سہیلی ہو پارو ـــــــ تمہارے اور کندن کے مجھ پر اتنے احسان ہیں اور...... اور...... میں اُسے کیسے دھتکار دوں۔

پارو۔ تم......

نینا۔ جب وہ میرے پاس بیٹھا چپ چاپ خلا میں دیکھتا رہتا ہے تب مجھے اُس پر رحم آجاتا ہے

پارو۔ تم اُس سے نفرت نہیں کرتیں نینا۔ تم اُسے پسند کرتی ہو۔

نینا۔ ہم سب بچپن میں اکٹھے کھیلے ہیں......

پارو۔ تم اُس سے نفرت نہیں کرتیں نینا۔ تم اُسے پسند کرتی ہو۔ تم اُس سے محبت کرتی ہو۔

نینا۔ میں بدن سنگھ کو نہیں بھولی۔

پارو۔ ہم خود نہیں جانتے۔ ہمارے من میں کیا ہے۔

نینا۔ میں جانتی ہوں میں بدن کا انتظار کر رہی ہوں۔ سال کے ایک ایک دن اس کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ لیکن کندن سنگھ سے مجھے نفرت نہیں۔ مجھے اس سے کس طرح نفرت ہو سکتی ہے ـــــــ تمہارے بھائی سے مجھے کس طرح نفرت ہو سکتی ہے۔

پارو۔ تم میری پروا نہ کرو۔ تم اپنے دل کو ٹٹولو۔ اگر وہاں اس کے لئے کوئی جگہ ہے تو اسے اپنالو۔ نہیں تو اسے جواب دیدو ـــــــ کورا جواب دے دو۔

نینا۔ اُس نے میری اتنی مدد کی ہے۔ اُس نے مجھ پر اتنے احسان کئے ہیں۔

پارو۔ تم ان احسانوں کی پروا نہ کرو۔ تم اپنے دل کو ٹٹولو۔

نینا۔ میں سچ کہتی ہوں میں ہر سال، سال کے ایک ایک دن اس کا انتظار کرتی رہی ہوں

پارو (غصّہ کو زبردستی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے) لیکن تم نے اس کو بھی تو نہیں ٹھکرایا تم سال کے ایک ایک دن، دن کے ایک ایک پل بدن کا انتظار کرو ـــــــ

مَیں تمہیں نہ روکوں گی۔ لیکن آسا کے ایک باریک سے تار پر اُسے بھی نہ لٹکا رکھو نینا

[بیک گراؤنڈ میں دور عورتوں کے گانے کی مبہم سی آواز سنائی دیتی ہے]

——مَیں تم سے پرارتھنا کرتی ہوں —— اس باریک تار کو بھی کاٹ دو

(مہری آتی ہے)

مہری۔ کندن سنگھ آئے ہیں۔

پارو۔ بسنت پُوجا شروع ہو گئی ہے۔ میں جاتی ہوں۔ تم کندن سنگھ کو آج بالکل جواب دے دو۔ آسا کی اس دھیمی دھیمی آنچ میں اسے تِل تِل کر کے نہ جلاؤ۔

(چلنے لگتی ہے)

نینا۔ کہاں چلی ہو پارو.....

پارو۔ تم آج اسے......

نینا۔ تم کندن سنگھ کو لے جاؤ۔ تم اسے اپنے ساتھ ہی لیجاؤ۔ وہ مجھے اُنسو میں چلنے کو کہیگا

پارو۔ تم آج اُسے جواب دے دو۔ تم آج اُسے ٹھکرا دو۔ اُسے اچھی طرح بتا دو کہ تمہارے دوار سے اُسے کچھ نہ ملیگا۔

(چلی جاتی ہے۔ نینا پھر بے دلی سے باہر کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ کندن سنگھ داخل ہوتا ہے)

کندن۔ نینا

(نینا چپ رہتی ہے)

—— مَیں تمہیں آج لینے آیا ہُوں نینا

(نینا چپ رہتی ہے)

کُندن ۔ نینا تم نے وعدہ کیا تھا

(نینا چُپ رہتی ہے)

—— تم آج بھی اسی طرح اُداس اور اَن منی سی کھڑکی میں بیٹھی ہو۔ تمہاری چُنری اسی طرح کھڑکی میں ٹنگی ہوئی ہے —— اُٹھو نینا۔ دیکھو بسنت اتسو اپنے پورے جوبن پر ہے

[دُور میلے سے گانے کی ہلکی ہلکی آواز اُٹھتی ہے جو آہستہ آہستہ اُونچی ہوتی جاتی ہے]

رنگ راس کرو بھاگن ہیں
ہوئے پورن پچھلے بھاگ ری

[یہ آواز اور اس کے ساتھ اُتسو میں شامل ہونے والوں کا شور اُونچا اُٹھ کر سٹیج پر چھا جاتا ہے اور پھر یک دم بند ہو جاتا ہے]

—— دیکھو دیکھو لڑکیاں اپنے چنیر کمر سے باندھ رہی ہیں۔ تمہارے پاؤں میں کیا ذرا بھی گدگدی نہیں ہوتی۔

(نینا چُپ رہتی ہے)

کُندن ۔ تمہارے ہونٹ اُن کے سُر میں سُر ملانے کے لئے نہیں تھرتھراتے (لمبی سانس لے کر) تم کتنا گایا کرتی تھیں کتنا ناچا کرتی تھیں —— تمہیں کیا ہو گیا ہے نینا۔ دیکھو تمہاری سب سہیلیاں زندگی سے جھلملاتے بسنتی کپڑے پہنے گا رہی ہیں۔ جھُولے جھُلا رہی ہیں اور تم یہ اداس اور مغموم لباس پہنے اس کھڑکی میں ان منی سی بیٹھی ہو۔

نینا ۔ تم جاؤ کُندن ۔ تم اُتسو میں حصّہ لو۔

کندن۔ میں تمہارے بغیر نہ جاؤں گا۔ میں اس بار تمہیں ضرور لے کر جاؤں گا۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔

نینا۔ نہیں کندن، میں نہ جاؤں گی۔

کندن۔ تم کتنا گایا کرتی تھیں۔ کتنا ناچا کرتی تھیں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے نینا، اٹھو چنری پہنو، یہ کھڑکی بند کرو۔

نینا (لمبا سانس لیتی ہے) شاید میری چنری وہیں ٹنگی رہے گی اور یہ کھڑکی.....

کندن۔ دیکھو اپلوں کا کتنا بڑا ڈھیر لگ گیا ہے۔ سرسوں کے ہاروں سے وہ اتنا ڈھک گیا ہے کہ وہ پیلے پھولوں کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے۔ تمہاری سب سہیلیاں پیلے پیلے گجرے ہاتھوں میں پہنے، پیلی پیلی چنریاں لہراتی بسنت کی دیویاں بنی ناچ گا رہی ہیں۔ تم کس طرح......

نینا۔ تم مجھے یہ سب نہ سمجھاؤ۔ مجھے یہ سب نہ سمجھاؤ۔ تم جاؤ کندن

کندن۔ میں نہ جاؤں گا۔ اگر تم نہ جاؤ گی۔

نینا۔ میں چار سال سے نہیں جا رہی۔

کندن۔ تو میں بھی کب جاتا ہوں۔ ہر سال جب یہ تہوار آتا ہے۔ میں نئی امید لئے تمہارے دوار پر آتا ہوں۔ پر نراس لوٹ جاتا ہوں۔ چرواہے اپنے اپنے ڈھور ڈنگر لئے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ بڑے بوڑھے ہاتھوں میں اپلے لئے ہولی کا ڈھیر لگاتے ہیں۔ عورتیں سرسوں کے ہار چڑھاتی ہیں، چرواہے بنسری بجاتے ہیں۔ سب ناچتے گاتے موج اڑاتے ہیں۔ لیکن میں تنہا اور اداس اور خاموش ویرانوں میں بھٹکتا پھرتا ہوں۔

نینا۔ نا اب تم اور نہ بھٹکو، تم اس اتسو میں حصّہ لو۔ میری آس چھوڑ دو۔ تمہاری بہن

نے ابھی کہا تھا ......

کندن۔ میری بہن نے کیا کہا تھا؟

نینا۔ کہ آسمان کے باریک تار کے سہارے میں تمہیں کھینچے لئے آتی ہوں ....

کندن۔ میں خود بخود کھنچا چلا آتا ہوں۔

نینا۔ پاروؔ نے کہا —— اگر تمہیں بدن ہی کی بات جوہنی ہے تو کندن کو کوراجواب دیدو۔

کندن۔ تم شوق سے بدن کا راستہ دیکھو۔ لیکن تم نے کہا تھا .....

نینا (خلا میں دیکھتے ہوئے) چار سال پہلے باپو نے اُسے دھتکار دیا تھا۔ "تم اس کے لائق نہیں ہو"۔ اُنھوں نے اس سے کہا تھا —— باپو محنتی آدمی تھے۔ سب زمین جائداد اُنھوں نے خود پیدا کی تھی اور بیکار اور نالائق آدمی کو وہ پسند نہ کرتے تھے —— بدن نے کہا تھا "نینا، اگر تیرے پتا اتنا کچھ پیدا کر سکتے ہیں تو کیا میں نہیں کر سکتا۔

(کندن چپ رہتا ہے)

—— (اسی طرح خلا میں دیکھتے ہوئے) بسنت کی اُس شام کو جب وہ اسی اُفق سے اُداس لوٹا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا "نینا میں ابھی چلا جاؤں گا۔ آج ہی پوپا نگر کو چھوڑ دوں گا اور تب تک اس گاؤں میں پاؤں نہ رکھوں گا۔ جب تک تمہارے لائق نہ بنوں گا"۔

(کندن چپ رہتا ہے)

—— اُس نے کہا تھا —— "نینا میں اسی بسنت کے دن آؤں گا اور اتنا کما کر لاؤں گا کہ تمہارے پتا سے مجھے تمہارے لئے کہنے کی ضرورت نہ پڑے گی"۔

کندن۔ مجھے یہ سب معلوم ہے۔

نینا۔ وہ ضرور بیدار ہو کر آئیگا (مسرور ہو کر) وہ اتنے تحفے لائیگا کہ مجھ سے سنبھالے نہ نہ سنبھلیں گے......

کندن۔ تم ویسی ہی بچی ہو۔ ابھی تک اسی خیالی دنیا میں بستی ہو۔ بھول جاتی ہو کہ بدن سنگھ فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا ہے......

نینا۔ وہ ضرور آئے گا۔ جنگ میں فتح حاصل کر کے آئیگا۔ میں اس کا انتظار کروں گی

کندن۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اس بسنت وہ نہ آیا تو.....

نینا۔ تم میرے لئے کیا کچھ نہیں کرتے رہے۔ ماتا پتا کی موت کے بعد تم نے میری کتنی مدد نہیں کی۔ تم نہ ہوتے تو میں اس طرح رانی بنی نہ بیٹھی ہوتی۔ کہاں کہاں کے رشتے دار اس زمین، جائداد کو ہڑپ کرنے کیلئے نہیں آئے۔ تم نے اُن سے مقدمہ لڑنے میں، اُنکے اتیاچاروں کا مقابلہ کرنے میں میری امداد کی، زمین جائداد کے انتظام میں میری سہائتا کی...

کندن۔ تم کیوں بار بار اس کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ کرتی ہو

نینا۔ اور میں کبھی تمہیں صاف جواب نہ دے سکی اور یا رو کہتی ہے — میں تمہارا حوصلہ بندھاتی رہی ہوں میں تمہیں اپنے جال میں پھنساتی رہی ہوں۔

کندن۔ تم نے کبھی میرا حوصلہ نہیں بڑھایا۔ تم ہمیشہ ٹھکرا رہی ہو.....

نینا۔ میں بدن سنگھ کا انتظار کرتی....

کندن۔ میں نے تمہیں کب روکا۔ بدن سنگھ کیا میرا دوست نہ تھا۔ آج کہیں اگر وہ آجائے تو مجھ سے زیادہ خوشی کسی کو نہ ہو۔

(نینا چپ رہتی ہے)

— اور کون جانتا ہے کہ میں اسی لئے تم سے محبت نہیں کرتا۔ بدن جب یہاں تھا

تو ہم لوگ کتنے خوش تھے۔ اس کو تم سے کتنی محبت تھی۔ تم کتنی خوش تھیں ——
اُس کے جانے کے بعد تم اُداس رہنے لگیں۔ تم نہیں جانتی نینا۔ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ تم تڑکے تڑکے اٹھ کر تم کام میں جُٹ جاتی ہو اور سارا سارا دن کھانے پینے کی سُدھ بُدھ بھلا کر کام کرتی رہتی ہو —— اپنے جسم کی، اپنے کپڑوں کی، اپنے بالوں کی تم پروا نہیں کرتیں۔ ناچ گانے، ہنسی مذاق کسی چیز سے تمہیں رغبت نہیں تو میں دل مسوس کر رہ جاتا ہوں اور چاہتا ہوں کسی طرح بھی تمہیں سکھ پہنچا سکوں۔ کسی طرح بھی تمہیں خوش رکھ سکوں .....

(نینا چُپ رہتی ہے)

—— میں نے بدن سنگھ کی کتنی تلاش نہیں کی۔ جب یہ پتہ چلا کہ وُہ بھرتی ہو کر جنگ پر چلا گیا ہے تو تمہارے غم کے خیال سے میرے دل کو بڑا دھکا لگا تھا —— لیکن اس بات کو بھی تین سال بیت گئے

نینا۔ وُہ ضرور آئے گا۔ وُہ اتنا کما کر لائے گا.....

کندن۔ لیکن نینا وُہ فوج میں بھرتی ہو کر گیا ہے۔

نینا۔ ان چار برسوں میں اُسے ہر روز اپنے سپنوں میں دیکھتی رہی ہوں۔ سوتے ہی میں نہیں جاگتے میں بھی، سارا سارا سال اس دن کا انتظار کرتی رہی ہوں اور بسنت کے دن اس کھڑکی میں بیٹھ کر اس کی راہ دیکھتی رہی ہوں —— مجھے اب بھی ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے وُہ ابھی آ کر کہے گا —— نینا میں آ گیا۔

کندن (ہنستا ہے) پارو مجھ سے کہا کرتی ہے —— تم ہوا میں بستے ہو۔ ایک مدھم سی اُمید کے سہارے تم اپنی زندگی برباد کر دو گے۔ تم اسی طرح پل پل چھن چھن جلتے

رہو گے اور نینا کسی اور سے شادی کرے گی . . . .

نینا۔ نینا یا بدن سنگھ سے شادی کرے گی یا . . . .

کندن۔ کہو نینا، یا . . . .

نینا (ہنستی ہے) تم جانتے ہو۔

کندن (طنز سے ہنستا ہے) تو ہم دونوں تمام عمر کنوارے رہیں گے۔ نینا تم میری طرف نہ دیکھو، لیکن ذرا اپنی طرف تو دیکھو —— تمہارے گیہوں کے پودوں میں بالیاں لگ آئی ہیں۔ تمہاری ایکھ بسنت کی ہوا کے لمس سے سرسرا رہی ہے۔ تمہارے کھیتوں میں سرسوں کے پھول آ گئے ہیں۔ تمہارے باغوں میں بہار آ گئی ہے —— لیکن تم خود پت جھڑ کے پتے کی طرح مرجھائی بیٹھی ہو۔ اُٹھو نینا۔ اُٹھو میرے سنگ چلو۔ بسنت اُتسو . . . .

نینا۔ کندن سنگھ تم جاؤ۔ میری قسمت میں بسنت اُتسو دیکھنا نہیں۔

کندن۔ تم نے وعدہ کیا تھا، تم اس بسنت کو ضرور چُنری پہنو گی۔

نینا۔ چُنری پہننا میری قسمت میں نہیں لکھا۔ بدن سنگھ آتا تو . . . .

کندن۔ بدن اب نہ آئیگا۔

(لاجو ہوا کے جھونکے کی طرح داخل ہوتی ہے)

لاجو۔ بدن سنگھ آ گئے۔

نینا۔ آ گئے . . . . . .

(کاسنی بھاگتی آتی ہے)

کاسنی۔ نینا، بدن بھیّا آ گئے۔

لاجو۔ وُہ دیکھو۔ وُہ بچّوں اور بچیوں کو تحفے بانٹ رہے ہیں۔
نینا (کھڑکی میں سے دیکھتے ہوئے) کہاں؟ کہاں؟ .....
کاسنی۔ وُہ .....
نینا۔ خاکی وردی پہنے .....
لاجو۔ وُہ صوبیدار میجر بن کر آئے ہیں ـــــ اتنے تحفے ساتھ لائے ہیں اتنے .....
کاسنی۔ کئی ٹرنک اُن کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں۔ وُہ دیکھو، وُہ سب ادھر ہی آ رہے ہیں۔
نینا۔ کندن میں بسنت اتسو میں چلوں گی۔ وہ میری چُنری دو۔ میں جوتا پہن لوں میں اُسے راستے میں جا کر ملوں گی۔ اس بار کا بسنت اُتسو .....
کندن (چُنری اُتار کر دیتے ہوئے) یہ لو چُنری اور مجھے اجازت دو۔
نینا۔ تم میرے سنگ نہ چلو گے کندن، اپنے بدن بھیّا .....
کندن۔ نہیں نینا۔ بسنت اُتسو دیکھنا شاید میری قسمت میں نہیں۔
نینا (کھڑکی بند کرتی ہے) ہم تم پہلے کی طرح رہیں گے کندن ـــــ بہن بھائی .....
کندن۔ نہیں نینا۔ میں جاتا ہوں۔ تم نے اپنی کھڑکی بند کر دی۔ میرے کمرے کی کھڑکی کھُلی رہے گی لیکن وہاں میری بیقرار روح کے علاوہ کوئی میرا انتظار نہ کرے گا۔

فیڈ آؤٹ

سوکھی ڈالی

افراد

دادا	کرم چند	پریش
بھاشی (سٹیج کے باہر)	ملّو	اندو
جگدیش (سٹیج کے باہر)	بیلا	بڑی بہو
منجھلی بہو	منجھلی بھابی	بڑی بھابی

ماں (اندو کی ماں، بیلا کی ساس۔ عام طور پر چھوٹی بھابی)

رجوا

پہلا منظر:۔

[انسانی ترقی کے اس دور میں جب انفرادی آزادی کو طوائف الملوکی کی حد تک توسیع دی جاتی ہے، اور ڈکٹیٹرشپ اور مطلق العنانی کو مہذب سماج میں بے حد مذموم خیال کیا جاتا ہے۔ دادا مولراج اپنے سارے کے سارے کنبے کو ایک یونٹ (UNIT) بنائے، اس پر پورے طور سے اپنا تسلط جمائے اس عظیم بڑ کی طرح اٹل کھڑے ہیں جس کی لمبی لمبی شاخیں ایک بڑی چھتری کی طرح دھرتی پر اپنا سایہ کئے ہوئے، بیشمار

گھونسلوں کو اپنے پتوں میں چھپائے، برسوں سے طوفانوں اور آندھیوں کا مقابلہ کئے جا رہی ہیں۔

برسوں اس بڑ کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے دادا بڑ ہی کی طرح عظیم دکھائی دیتے ہیں۔ عمر کی ۷۲ سردیاں گرمیاں دیکھنے پر بھی ان کا جسم ابھی تک نہیں جھکا۔ اور ان کی سفید ڈاڑھی بڑ کی لمبی لمبی ڈاڑھیوں کی طرح اُن کی ناف کو چھوتی ہوئی گویا دھرتی کو چھو لینے کا عزم رکھتی ہے۔

دادا کا بڑا لڑکا ۱۹۱۴ کی جنگ میں سرکاری خدمات سرانجام دیتا ہوا کام آیا تھا جس کے صلے میں گورنمنٹ نے دادا کو ایک مربع زمین عطا کی تھی۔ لیکن دادا سرکار کی اس عنایت پر ہی قانع نہیں رہے۔ اپنی ہمت، محنت، اولوالعزمی دوراندیشی اور رسوخ سے اُنہوں نے ایک کے دس مربعے بنا لئے۔ ان کے دو بیٹے اور پوتے زمین، فارم، ڈیری اور چینی کے اس کارخانہ کا کام دیکھتے ہیں جو اُنہوں نے حال ہی میں اپنی زمین میں لگایا ہے۔ سب سے چھوٹا پوتا ابھی ابھی نائب تحصیلدار نامزد ہو کر اسی قصبہ میں متمکن ہوا ہے اور اس کی شادی بھی حال ہی میں لاہور کے متمول گھرانے کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے ہوئی ہے

ان کے چھوٹے پوتے کا نائب تحصیلدار اور ان کی چھوٹی بہو کا تعلیمیافتہ ہونا بذاتِ خود دو اہم باتیں ہیں —— پہلی بات سے سرکاری حلقوں میں ان کا رسوخ بھی بڑھ جانے کے امکانات ہیں۔ گاؤں میں ان کی عزت میں کچھ اور اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ساتھ ہی دوسری بات سے اُن کے کنبے کو ایک خطرہ سا لاحق ہو گیا ہے۔ ان کی تینوں بہوئیں (جو گھر میں بڑی بھابی، منجھلی بھابی

اور چھوٹی بھابی کے نام سے یاد کی جاتی ہیں) سیدھی سادھی عورتیں ہیں۔ ان کے گھر کی عورتوں میں ان کی پوتی اندو ہی سب سے زیادہ پڑھی لکھی سمجھی جاتی ہے جس نے گاؤں کے پرائمری سکول تک بڑی کامیابی سے تعلیم پائی ہے۔ گھر میں اسکی چلتی بھی کافی رہی ہے اور دادا اپنی اس پوتی کو پیار بھی بہت کرتے ہیں لیکن اس گریجویٹ چھوٹی بہو کے آنے سے کنبہ کے تالاب میں اس طرح لہریں سی پیدا ہو گئی ہیں۔ جس طرح نتھرے ساکت پانی میں بڑی سی اینٹ گرنے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

پردہ عمارت کے برآمدے میں کھلتا ہے۔ یہ برآمدہ دراصل گھر کی عورتوں کی ریندے وو (RENDEZVOUS) ہے۔ دن بھر اس میں ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ کبھی گھر کی عورتیں دھوپ سینکتی ہیں۔ کبھی چرخے کاتتی ہیں کبھی گپیں اڑاتی ہیں، کبھی لڑتی جھگڑتی ہیں اور کچھ نہ ہو تو غسل خانے میں پڑے کپڑے ہی دھویا کرتی ہیں ——— یہ غسلخانہ برآمدے کے باہر احاطے میں ہے ——— دائیں دیوار کے کونے میں جو دروازہ ہے اس کے ساتھ ہی باہر کو ——— رسوئی وغیرہ سے نبٹ کر بعد دوپہر گھر بھر کی عورتیں عام طور پر یہاں کپڑے دھویا کرتی ہیں اور 'تھپ' تھپ' دھپ' دھپ' کی گونج برابر اس برآمدے میں آیا کرتی ہے۔

برآمدے کی سامنی دیوار کے درمیان ایک چھوٹی سی گیلری ہے جس میں پہلے منجھلی بہو اور بڑی بہو کے کمرے ہیں (جن کی کھڑکیاں برآمدے میں کھلتی ہیں) پھر منجھلی بھابی اور بڑی بھابی کے۔ چھوٹی بھابی کا کمرہ (جو اندو کی ماں اور چھوٹی بہو

بیلا کی ساس ہے) دائیں طرف کو ہے۔ اس کا دروازہ سٹیج کے ادھر کو ہے۔ چھوٹی بہو کا کمرہ اُوپر کی منزل پہ ہے اور بائیں دیوار میں سیڑھیاں بنی ہیں جو اوپر کو جاتی ہیں۔

دونوں کھڑکیوں کے نیچے دو تخت پوش بچھے ہیں۔ ایک دو خالی چارپائیاں دیواروں کیساتھ کھڑی ہیں۔ ایک پرانے فیشن کی بڑی آرام کرسی بھی سامنے کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

چونکہ دوپہر ہونے میں ابھی کافی دیر ہے۔ اس لئے برآمدے میں بھی نسبتاً خاموشی ہے۔ صرف گیلری سے عورتوں کے جلدی جلدی باتیں کرنے کی آواز آرہی ہے۔ پردہ اُٹھنے کے کچھ لمحے بعد اندو تیز تیز گیلری سے نکلتی ہے اور بپھری ہوئی سی بائیں طرف کے تخت پوش پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے بڑی بہو متانت سے چلتی ہوئی آتی ہے —— اندو کے تیور چڑھے ہوئے ہیں۔ بہو شانت اور گمبھیر ہے]

بڑی بہو (اندو کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے) آخر کچھ کہو بھی، کیا کہا چھوٹی بہو نے؟

اندو (چپ)

بڑی بہو۔ کیا کہہ دیا اس نے جو اتنی بپھری ہوئی ہو؟

اندو (غصے سے) اور کیا اینٹ مارتی؟

بڑی بہو۔ کچھ کہو بھی . . . . .

اندو۔ میرے میکے میں یہ ہوتا ہے، میرے میکے میں یہ نہیں ہوتا (ہاتھ مٹکا کر) اپنے اُدھر

اپنے میکے کے سامنے تو وہ کسی کو کچھ گنتی ہی نہیں —— ہم تو اُس کے لئے

بھوہڑ گنوار اور بدتمیز ہیں۔

بڑی بہو (حیرت سے) کیا.....

اندو۔ بیٹھک کے باہر مصرانی کھڑی رو رہی ہے۔ مَیں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ

بہو رانی نے اسے کام سے ہٹا دیا ہے۔

بڑی بہو (اسی حیرت سے) کام سے ہٹا دیا ہے۔ آخر کیا شکایت تھی اس سے؟

اندو۔ شکایت یہ تھی کہ اسے کام کرنے کا شعور نہیں۔

بڑی بہو۔ شعور نہیں —— !

اندو۔ اس بیچاری نے کہا بھی کہ میں دس پانچ دن میں سب کچھ سیکھ جاؤنگی۔ آخر کے دن

ہوئے مجھے آپ کا کام کرتے؟ لیکن بہو رانی نہیں مانیں۔ جھاڑن اُنہوں نے

اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور کہا کہ ہٹ تو۔ مَیں سب کچھ کر لوں گی۔ ابھی تک

اتنا تو شعور نہیں تجھے کہ بیٹھک کیسے صاف کی جاتی ہے۔ پانچ دس دن میں تو

کیا سیکھ جائیگی۔

بڑی بہو۔ شعور نہیں لیکن.....

اندو۔ میں نے جا کر سمجھایا کہ بھابی دس سال سے یہی مصرانی گھر کا کام کر رہی ہے۔

گھر بھر کی صفائی کرتی ہے۔ برتن ملتی ہے۔ کپڑے دھوتی ہے۔ نہ جانے تمہارا کونسا

ایسا کام ہے جو اس سے نہیں ہوتا اور پھر میں نے سمجھایا کہ بھابی نوکر سے کام

لینے کی تمیز بھی ہونی چاہیئے۔

بڑی بہو۔ ہاں اور کیا.....

اندو۔ جھٹ سے بولیں ـــــــ "وہ تمیز تو بس آپ۔ لوگوں کو ہے"۔ میں نے کہا "تم تو لڑتی ہو۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتی تھی کہ نوکر سے کام لینے کا بھی ڈھنگ ہوتا ہے" اس پر تنک کر بولیں "اور وہ ڈھنگ مجھے نہیں آتا۔ میں نے نوکر جو یہیں آکر دیکھا ہے" پھر کہنے لگیں "کام لینے کا ڈھنگ اسے آتا ہے جسے کام کی پرکھ ہو۔ صرف صبح شام جھاڑو دے دینے ہی سے کمرہ صاف نہیں ہو جاتا۔ اس کی بناوٹ سجاوٹ بھی کوئی چیز ہے۔ نہ جانے تم لوگ کیسے ان پھوہڑ نوکروں سے گذارا کر لیتے ہو۔ ہمارے میکے میں تو ایسی پھوہڑ مصرانی دو دن چھوڑ دو گھڑی بھی نہ ٹکتی۔

بڑی بہو۔ کہیں اس نے یہ سب باتیں؟

اندو۔ اور کیسے کہی جاتی ہیں ـــــــ جب سے آئی ہے یہی تو سن رہے ہیں ـــــــ نوکر اچھے ہیں تو اس کے میکے میں۔ کھانا پینا اچھا ہے تو اس کے میکے میں۔ کپڑے پہننے کا سلیقہ ہے تو اس کے میکے والوں کو ـــــــ ہم تو نہ جانے کیسے جی رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا کچھ بھی نہیں آتا۔ ہمارے نوکر پھوہڑ، ہمارے پڑوسی پھوہڑ، ہم خود پھوہڑ......

بڑی بہو (مبہوت دسا کن سنتی ہے)۔

اندو۔ میں نے بھی کہہ دیا ـــــــ کیا بات ہے بھابی تمہارے میکے کی۔ ایک نمونہ تمہیں جو ہو سا ایک مصرانی بھی لے آتیں تو ہم گنوار بھی اس سے کچھ سیکھ لیتے

[دائیں دیوار کے کمرے سے ماں داخل ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے رجو ہے]

ماں۔ کیوں اندو بیٹی کیا بات ہوئی۔ یہ رجو رو رہی ہے۔ کوئی کڑی بات کہہ دی چھوٹی

بہو نے اسے؟

اندو۔ میٹھی بات وُہ کب کہتی ہیں جو آج خاص طور پر کڑوی کہیں گی۔

ماں۔ یہ آج تم کیسی جلی کٹی باتیں کر رہی ہو۔ چھوٹی بہو سے جھگڑا ہو گیا ہے کیا؟

رتھوا۔ (بھرے ہوئے گلے سے) ماں جی! آج اُنہوں نے مجھے زبردستی کام سے ہٹا دیا ...
اتنے برس ہو گئے آپکی سیوا کرتے کرتے، کبھی کسی نے اس طرح بے عزتی نہ کی تھی۔ مجھے
ماں جی آپ اپنے پاس ہی رکھئے۔ میں آج سے ان کا کام کرنے نہ جاؤں گی۔

ماں۔ وُہ تو ابھی بچی ہے مصرانی، تو بھی اس کے ساتھ بچّی ہو گئی۔

اندو (طنز سے مُنہ بچکا کر) جی ہاں بچی ہے۔ روٹی کو چوچی کہتی ہے۔ اسے تو بات ہی کرنی
نہیں آتی (غصّے سے) اپنے اور اپنے میکے کے سامنے تو وُہ کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں
اور پھر گز بھر کی زبان ....

بڑی بہو۔ بات یہ ہے ماں جی کہ چھوٹی بہو کو ہمارا کھانا پینا، پہننا، اوڑھنا، رکھ رکھاؤ کچھ
بھی پسند نہیں۔ وُہ ہم سے، ہمارے پڑوس سے، ہماری ہر بات سے نفرت کرتی ہے

ماں (فکرمندی سے) پھر کیسے چلیگا۔ ہمارے گھر میں تو مل کر رہنا۔ بڑوں کا ادب کرنا، اپنے
گھر کی روکھی سوکھی کو دوسرں کی چپڑی سے اچھا خیال کرنا، نوکروں پر رحم اور
چھوٹوں پر ....

(منجھلی بہو باہر سے ہنستی ہوئی داخل ہوتی ہے)

منجھلی بہو۔ خی ہی ... خی ہی ... خی ہی ہی .... ہا ہا ہا ....

اندو۔ کیا بات ہے بھابی جو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی ہو؟

منجھلی بہو۔ خی ہی ہی .... خی ہی ہی ... (ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہے) ہا ہا۔ ہا ہا — ہا

(گیلری سے منجھلی بھابی اور بڑی بھابی داخل ہوتی ہیں)

دونوں۔ کیا بات ہے جو آج اتنی ہا ہا ہی ہی ہو رہی ہے

اندو۔ یہ بھابی ہیں کہ ہنسے جا رہی ہیں اور کچھ بتاتی ہی نہیں۔

منجھلی بہو۔ میں کہتی ہوں......

(پھر ہنس پڑتی ہے)

بڑی بہو۔ آخر کچھ کہو بھی۔

منجھلی بہو۔ آج بھائی پریش کی وہ گت بنی کہ بیچارے اپنا سا منہ لیکر رہ گئے .....

خی ہی ہی۔ ہا ہا۔ ہا۔ ہا ہا۔ ہا

ماں۔ اوہو، تمہاری ہنسی بھی بہو......

منجھلی بہو۔ میں کیا کروں۔ میں ہنسی کے مارے مر جاؤں گی۔ ابھی ابھی چھوٹی بہو نے پریش کی وہ گت بنائی کہ بیچارہ اپنا سا منہ لے کر دادا جی کے پاس بھاگ گیا۔

بڑی بہو، اندو۔ بات کیا ہوئی؟

منجھلی بہو۔ میں تو ادھر اوپر سامان رکھنے گئی تھی۔ بہت باتیں تو میں نے سنی ہی نہیں بہت سمجھ بھی نہیں آئیں —— انگریجی میں گٹ مٹ کر رہے تھے ——

چھوٹی بہو کا پارہ کچھ چڑھا ہوا ہے۔ اتنا معلوم ہوا کہ پریش نہا کر اوپر کمرے میں گیا۔ تو بہو رانی نے سارا فرنیچر نکال کر باہر رکھ دیا تھا۔ پریش نے اس کی وجہ پوچھی چھوٹی بہو نے کہا۔ میں ان ٹوٹی پھوٹی کرسیوں اور گلے سڑے فرنیچر کو اپنے کمرے میں نہ آنے دوں گی۔ پریش کہنے لگا۔ "ہمارے بزرگ . . . ." بات کاٹ کر بہو نے کہا۔ "ہمارے بزرگ تو ننگے بُچے جنگلوں میں گھومتے تھے تو کیا ہم بھی ان کی پیروی کریں" (ہنستی ہے)

اور جو سامان پڑا تھا، وہ بھی اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

اندو۔ پھر۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔

منجھلی بھابی۔ چھوٹی بہو۔۔۔۔

ماں۔ یہ تو۔۔۔۔

منجھلی بہو۔ پریش نے کہا "اس فرنیچر پر ہمارے دادا بیٹھتے تھے، پتا بیٹھتے تھے، چچا بیٹھتے تھے، بھائی بیٹھتے تھے ـــــ ان لوگوں کو کبھی شرم نہیں آئی۔ انہوں نے کبھی فرنیچر کے گلے سڑے ہونے کی شکایت نہیں کی۔ اب اگر میں جا کر اس کی شکایت کروں گا تو دادا کہیں گے کہ تحصیلدار ہوتے ہی بہک گے گا، دماغ آسمان پر چڑھ گیا ہے (ہاتھ مٹکا کر) نا بھائی میں یہ بات ان سے نہیں کہہ سکتا۔

منجھلی اور چھوٹی بھابی۔ ہاں ٹھیک ہی تو کہا پریش نے۔

ماں۔ ہاں پریش تو۔۔۔۔

منجھلی بہو۔ تب بہو نے کہا۔ "تو نہ کہو۔ میں تو اس گلے سڑے سامان کو کمرے کے نزدیک تک نہ پھٹکنے دوں گی۔ اس بدزیب فرنیچر سے تو زمین پر چٹائی بچھا کر بیٹھ رہنا اچھا۔ میرے میکے میں۔۔۔۔

اندو (غصے سے) بس اسے تو اپنے میکے کی پڑی رہتی ہے جو بیسیوں گھڑی۔

منجھلی بہو۔ اور چھوٹی بہو نے اپنے میکے کے بڑے بڑے کمروں اور ان کے بیش قیمت فرنیچر کا بکھان کیا (ہنستی ہے) اور بھلے پریش کی کوئی بات نہ چلنے دی اور بیچارے بھیگی بلی بنے داداجی کے پاس چلے گئے۔ خی ہی ہی۔۔ خی ہی ہی۔۔۔۔

(ہنستی ہے۔ باقی سب اس کے ساتھ ہنستی ہیں)

——میں تو چپکے سے چلی آئی (منہ بچکا کر) زبان ہے چھوٹی بہو کی یا کترنی.....
اور پھر جب انگریزی بولنے لگتی ہے تو سمجھ ہی میں کچھ نہیں آتا۔ پریش بیچارہ تو اپنا سا منہ لیکر رہ جاتا ہے۔ جانے تحصیلدار کیسے بن گیا۔

اندو۔ بس زبان ہی زبان ہے۔ بات تو جب ہے جب کام بھی ہو۔ ایک کام کو کہو تو سو ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ وہ دادا جی نے چار کپڑے دھونے کو کہا تھا۔ وہ تو پڑے غسلخانہ میں سڑ رہے ہیں۔

ماں۔ غسلخانے میں پڑے ہوئے ہیں تو اٹھا کیوں نہیں لائی انہیں۔ جا بھاگ کر اٹھا لا اور بھگو کر آنگن میں ڈال دے۔ میں بہو کو سمجھا دوں گی —— اس طرح کیسے کام چلے گا.... (فکرمندی سے)...... پریش نے سمجھایا نہیں اسے۔

اندو۔ پریش کی تو جیسے وہاں بڑی شنوائی ہوتی ہے۔

(ہنستی ہے)

منجھلی بہو۔ وہ ململ کے تھان اور ابروں کی بات یاد ہے نہ۔ ابھی تک پڑے ہوئے ہیں۔ کہہ کہہ کر ہار گئے پریش مہاشے۔ بہو رانی نے انہیں رکھنے سے صاف انکار کر دیا اور شرم کے مارے لے جاتے نہیں دادا جی کے پاس، کچہری میں ہوں گے تحصیلدار، گھر میں تو ملازموں سے بھی گئے بیتے ہو جاتے ہیں۔

(ہنستی ہے۔ اندو اور بڑی بہو بھی ہنستی ہیں)

ماں۔ پر دادا جی کے کپڑے.....

بڑی بھابی۔ تم بھی بہن بس..... کیا اتنا پڑھ لکھ کر چھوٹی بہو اب کپڑے دھوئیگی،

اندو۔ کیوں اس کے ہاتھ کیا نمک مٹی کے ہیں جو گل جائیں گے۔

(باہر سے دادا کے حقہ گڑگڑانے کی آواز آتی ہے)

ماں۔ تم چلو اندو پھٹک کر کپڑے آنگن میں ڈال دو۔ انہیں شاید ضرورت ہو۔ مانگیں گے تو...... میں بہو کو سمجھا دوں گی......

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(وہی برآمدہ، دائیں طرف کے تخت پوش پر بستر بچھا ہوا ہے۔ دیوار کے ساتھ تکیہ لگا ہوا ہے۔ دادا آرام سے تکئے کے سہارے بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ ان کا منجھلا لڑکا کرم چند بیٹھا ان کے پاؤں دبا رہا ہے۔ حقہ پیتے پیتے دادا باہر احاطے میں بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ باہر غسل خانے سے جلدی جلدی نلکے کے چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ شاید کوئی بچہ اسے چلا رہا ہے۔ کیونکہ کرم چند کے چہرے پر تیور پڑ رہے ہیں۔

پردہ اُٹھنے کے کچھ لمحے بعد تک نلکے کے چلنے اور حقے کے گڑگڑانے کی آواز آتی رہتی ہے۔ پھر——)

کرمچند (غصے سے) بس کرو جگدیش! کیا کھٹ کھٹ لگا رکھی ہے۔ ذرا آرام کرنے دو۔ ابھی کھانا کھا کر......

دادا (حقے کی نے کو پرے ہٹا کر) نہیں نہیں کھیلنے دو بچوں کو (پھر حقہ گڑگڑاتے ہیں) بچے...... (ہنستے ہیں)...... بڑ کی ٹوٹی ہوئی شاخ لا کر آنگن میں لگا دی ہے اور

لسے پانی دے رہے ہیں —— نہیں جانتے کہ درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ محض پانی دینے سے نہیں پنپتی (حقہ گڑگڑاتے ہیں پھر نے کو چھوڑ کر کرمچند سے) میں کہا کرتا ہوں نا بیٹا کہ ایک بار درخت سے جو شاخ ٹوٹ گئی ٹوٹ گئی۔ اسے لاکھ پانی دو، پھر اس میں وہ تازگی نہیں آتی اور ہمارا یہ کنبہ بڑ کے اس وِشال پیڑ ....

کرمچند۔ لیکن شاید اب اس بڑ سے ایک شاخ ٹوٹ کر علیحدہ ہو جائے۔

دادا (تشویش سے) کیا کہتے ہو۔ کون علیحدہ ہو رہا ہے؟

کرمچند۔ شاید چھوٹا الگ ہو جائے۔

دادا۔ پریش —— لیکن کیوں اُسے کیا تکلیف ہے؟

کرمچند۔ تکلیف اُسے تو نہیں چھوٹی بہو کو ہے۔

دادا۔ لیکن مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔ اگر اسے کوئی شکایت تھی تو اُسے وہیں مٹا دینا چاہئے تھا۔ ہلکی سی خراش بھی —— اگر اس پر ٹنکچر نہ لگا دی جائے۔ بڑھ کر ایک بڑا گھاؤ بن جاتی ہے۔ پھر وہی گھاؤ ناسور بن جاتا ہے اور لاکھ مرہم لگاؤ ٹھیک نہیں ہوتا۔

کرمچند۔ مجھے تو معلوم نہیں لیکن چھوٹی بہو کی طبیعت میں غرور بیحد زیادہ ہے —— میں نے وہ رضائی کے ابرے اور ململ کے تھان لا کر دیئے تھے نہ۔ باقی سب نے تو پسند کر لئے لیکن سُنا کہ چھوٹی بہو کو پسند ہی نہیں آئے —— اپنے میکے کے گھرانے کو شاید وہ اس گھرانے سے اُونچا سمجھتی ہے اور اس گھر کو نفرت ......

دادا۔ بیٹا عظمت باہر کی چیز تو نہیں عظمت من کی ہونی چاہئے اور پھر بیٹا نفرت کو نفرت سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ بہو جب ہی الگ ہونا چاہے گی جب نفرت کے بدلے میں

اسے نفرت دی جائیگی لیکن اگر نفرت کے بدلے اسے محبت ملے تو اس کی یہ خواہش آہستہ آہستہ موہوم ہوتی ہوئی بالکل مٹ جائیگی (حقہ گڑگڑاتے ہیں) اور عظمت کبھی منوائی بھی نہیں جا سکتی۔ اپنے سلوک سے محسوس کروائی جا سکتی ہے —— ٹھونٹھ درخت آسمان کو چھونے پر بھی اپنی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں پر نہیں بٹھا سکتا۔ جب تک اپنی شاخوں میں وہ ایسے پتے پیدا نہیں کرتا۔ جن کی ٹھنڈی راحت بھری چھایا سے من کی سب تپش دور ہو جائے اور جس کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہمارے مَن پران کو ہرا کر دے۔

بھاشی (باہر سے) دادا جی ملّو اور جگدیش نے میرا بڑ کا پیڑ اکھاڑ دیا (مُلّو سے لڑتے ہوئے چیخ چیخ کر) کیوں اکھاڑا تو نے میرا پیڑ —— کیوں اکھاڑا . . . . .

دادا۔ پیڑ (ہنستے ہیں) بچے (ہنستے ہیں) ٹھہرو بھاشی لڑو مت بیٹا (مڑ کر) جانا کر مچند ذرا ہٹانا ان دونوں کو . . . . .

(کر مچند جاتا ہے۔ دادا پھر حقے کی نے منہ سے لگا لیتے ہیں —— پریش نیچی نظر کئے داخل ہوتا ہے)

دادا۔ آؤ بیٹا پریش۔ وہ میں نے ایک دو کپڑے بھجوائے تھے۔ ذرا دیکھنا بہو نے انہیں دھو ڈالا ہے یا نہیں۔ دھو ڈالے ہوں تو لے آؤ ذرا۔ پھر میں تم سے بات کرونگا . . . .

پریش۔ میں شرمندہ . . . . . .

دادا۔ نہیں دھلے تو پھر دُھل جائیں گے بیٹا۔ آؤ ادھر بیٹھو میرے پاس۔ میں تو تمہیں بُلانے والا ہی تھا۔ آؤ آؤ بیٹھو ادھر آ کر۔

(پھر حقہ گڑگڑانے لگتے ہیں۔ پریش چپ چاپ آ کر دادا کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

دادا (حقہ گڑگڑانا چھوڑ کر) بیٹے مجھے کرم چند سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ تمہاری بہو کو رضائی کے ابرے اور ململ کا تھان پسند نہیں آیا۔ دیکھو بیٹا تم اُسے شہر لے جاؤ اور اس کی پسند کی چیزیں خرید دو۔

پریش۔ میں..... میں.... لیکن میں نے سمجھا تھا کہ باقی سب نے تھان اور ابرے رکھ لئے ہیں

دادا۔ ہاں اور تو سب نے رکھ لئے ہیں لیکن چھوٹی بہو کو شاید یہ ڈیزائن پسند نہیں آئے۔ تمہارے چچا ٹھہرے پرانے زمانے کے آدمی۔ انہیں نئے فیشن کی چیزیں خریدنے کا سلیقہ نہیں۔ جبھی تو میں کہتا ہوں کہ چھوٹی بہو کو بازار لیجاؤ۔ وہ خود اپنے پسند کی چیزیں خریدیگی

پریش۔ جی.....

دادا (حقے کا ایک کش لگا کر) اور میں سوچتا تھا کہ اب بہو آ گئی ہے تو اندو کا جہیز تیار کرنے میں بھی وہ مدد دے گی....

پریش۔ جی میں اس لئے آیا تھا.....

دادا۔ ہاں ہاں کہو، جھجکتے کیوں ہو۔

پریش۔ بات یہ ہے جی کہ اس گھر میں بیلا کا دل نہیں لگتا۔

دادا۔ اتنی جلدی اس کا دل کیونکر لگ سکتا ہے۔ ابھی کتنے دن ہوئے ہیں اسے یہاں آئے ہوئے اور پھر بیٹا دل لگتا نہیں لگایا جاتا ہے۔

پریش۔ وہ دل لگاتی ہی نہیں

دادا۔ تو ہمیں اس کا دل لگانا چاہئے۔ وہ ایک بڑے گھر سے آئی ہے۔ اپنے پتا کی اکلوتی لڑکی ہے۔ کبھی ناطے رشتے داروں میں نہیں رہی۔ اس جھیڑ بھاڑ سے وہ گھبراتی ہوگی

اتنے شور و شر سے اسے وحشت ہوتی ہو گی ۔ ہم سب مل کر اس کا دل لگائیں گے ۔

پریش ۔ اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا ۔ سب اُس کی شکایت کرتے ہیں ۔ ابھی میرے پاس ماں ، بڑی تائی ، منجھلی تائی ، منجھلی بھابی ، بڑی بھابی ، اندو ، رجو ، سب آئی تھیں سب اُس کی شکایت کرتی تھیں ۔ طعنے دیتی تھیں کہ تو اس کے ہاتھ بک گیا ہے ۔ تو اُسے کچھ سمجھاتا نہیں اور ادھر وُہ ان سب سے نالاں ہے ۔ کہتی ہے سب میری بیعزتی کرتی ہیں سب میرا مذاق اڑاتی ہیں میرا وقت ضائع کرتی ہیں ——— مَیں ایسے محسوس کرتی ہوں جیسے مَیں بالکل اجنبیوں میں آ گئی ہوں ۔ آپ میری مانیں تو

——— و ——— و ———

دادا ۔ ہاں ہاں کہو .....

پریش ۔ بات یہ ہے جی کہ وُہ آزادی چاہتی ہے ۔ جہاں وُہ دوسروں کے دخل سے دوسروں کی نکتہ چینی سے نجات پا سکے ......

(دادا صرف حقّہ گڑگڑاتے ہیں)

——— وُہ سمجھتی ہے کہ وُہ چھوٹی بہو ہے ۔ اس لئے اس پر نکتہ چینی کرنا سب اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔

(دادا صرف حقّہ گڑگڑاتے ہیں)

——— اور وُہ اپنی علیحدہ گرہستی بسانا چاہتی ہے ۔ جہاں وُہ آزادی سے زندگی بسر کر سکے ۔ اُس کی خواہش ہے کہ اگر وُہ بارغ والا مکان اسے مل جائے تو وہ سکون و اطمینان سے وہاں رہے ۔ مجھے ہمیشہ تو یہاں رہنا نہیں ۔ کچھ دنوں کی بات ہے اس کی سب بیچینی ، سب تلملاہٹ کی تہ میں یہی بات کام کرتی ہے ۔ اب مَیں اسے

کیسے سمجھاؤں.....

دادا۔ (کچھ لمحہ چپ چاپ حقہ گڑگڑاتے ہیں۔ پھر) ہوں! (کھانستے ہیں) یوں اس جھنجٹ سے چھٹکارا پانے کا آسان علاج یہی ہے کہ تمہیں بارغ والا مکان دے دیا جائے۔ وہ پڑا بھی بیکار ہے اور فی الحال میں اس سے کسی طرح کا کام لینا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن تم جانتے ہو بیٹا! میرے جیتے جی یہ نہیں ہو گا (پھر حقہ گڑگڑاتے ہیں) میں جب اپنے کنبے کا خیال کرتا ہوں تو میرے سامنے بڑ کا مہان پیڑ گھوم جاتا ہے (کھنکار کر) سائے دار، ڈالیوں اور پھلوں پھولوں سے بھرا پرا (حقے کے ایک دو کش لگاتے ہیں) اور پھر میری آنکھوں کے سامنے اس عظیم بڑ کی شاخیں ٹوٹنے لگتی ہیں اور محض ایک ٹھونٹھ رہ جاتا ہے (آواز دھیمی جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں) اور میں کانپ جاتا ہوں۔ نہ بیٹا، میں اپنے جیتے جی یہ سب نہ ہونے دوں گا۔ تم فکر نہ کرو، میں سب کو سمجھا دوں گا۔ گھر میں کسی کو تمہاری بیوی کی بے عزتی کرنے کا حوصلہ نہ ہو گا۔ کوئی اس کا وقت ضائع نہ کرے گا ——— ایشور کی اپار کرپا سے ہمارے گھر میں پڑھی لکھی، عقلمند، سلیقے شعار بہو آتی ہے تو کیا ہم اپنی بیوقوفیوں سے اسے تنگ کر دیں گے۔ تم جاؤ بیٹا۔ کسی طرح کی چنتا کو من میں جگہ نہ دو۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال دوں گا۔ تم یقین رکھو۔ وہ اپنے آپ کو اجنبیوں میں محسوس نہ کرے گی۔ اسے وہی ادب اور عزت ملے گی جو اسے اپنے گھر میں حاصل تھی۔

پریش۔ جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔

دادا۔ اور دیکھو تم خود بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہاری کسی بات سے اس کا دل

نہ دُکھے۔ کوئی بھی ایسی بات نہ کرو جسے وہ اپنی بے عزتی خیال کرے۔

(پریش چلنے کو ہوتا ہے)

دادا۔ اور سُنو۔ تم اسے ساتھ لیجا کہ شہر سے سب چیزیں خرید لاؤ تم فکر نہ کرو۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لوں گا۔

پریش۔ جس طرح آپ مناسب سمجھیں؟

[چلا جاتا ہے۔ دادا پھر حقہ گڑگڑانے لگتے ہیں حقے کے کش لمبے ہیں جو اس بات کے شاہد ہیں کہ دادا حقہ پینے کے ساتھ ساتھ سوچ رہے ہیں]

دادا (جیسے اچانک انہیں کچھ سوجھ گیا ہو) رجوا . . . . رجوا . . . .

(پھر حقہ گڑگڑاتے ہیں۔ رجوا نہیں آتی۔ پھر آواز دیتے ہیں)

—— رجوا . . . . رجوا . . . . .

رجوا (دُور سے) جی آئی۔

(بھاگتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

دادا۔ چھوٹی بہو کے سوا سب کو میرے کمرے میں بھیجدو۔ کہو کہ سب کام چھوڑ کر میرے پاس آئیں (رجوا جانے لگتی ہے) اور سنو کوئی بھی نہ رہے —— سب سے کہنا کہ کچھ لمحوں کے لئے ضرور یہاں آجائیں۔

رجوا۔ جی میں ابھی جا کر سب سے کہہ دیتی ہوں۔

[چلی جاتی ہے۔ دادا پھر حقہ گڑگڑانے لگتے ہیں نلکے سے کسی کے کپڑے دھونے کی آواز آنے لگتی ہے۔ دادا اور بھی لمبے لمبے کش لیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کنبے کی عورتیں اور دوسرے افراد آنے لگتے ہیں لڑکے

اور نوجوان تخت پوش اور چارپائی پر بیٹھتے ہیں اور عورتیں برآمدے کے فرش پر۔ رجو ان کے بیٹھنے کے لئے موڑھے اور چٹائیاں لا کر بچھا دیتی ہے)

دادا۔ (حقہ پینا چھوڑ کر) اندو کہاں ہے۔ وہ نظر نہیں آتی۔

[پھر حقہ گڑگڑاتے ہیں اور ایک نظر سب کو دیکھتے ہیں۔ رجو غسل خانے کو جانے والے دروازے میں جا کر اندو کو آواز دیتی ہے۔ کپڑے دھونے کی آواز جو اس دوران میں برابر آتی رہی ہے۔ ایک دم بند ہو جاتی ہے]

اندو (باہر سے) جی آئی (اندر آ کر) میں نلکے پر تھی۔ کپڑے دھونے لگی تھی۔

دادا (ایک کش کھینچ کر) بیٹھو بیٹا (ایک دو لمحے تک حقہ گڑگڑاتے ہیں) میں نے آج تم سب کو ایک خاص کام سے بلایا ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا کہ چھوٹی بہو کا یہاں جی نہیں لگا۔

اندو دادا جی . . . .

دادا۔ اندو بیٹا مجھے اپنی بات کہہ لینے دو۔ مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا کہ چھوٹی بہو کا یہاں جی نہیں لگا قصور اس کا نہیں قصور ہمارا ہے۔ وہ ایک بڑے گھر کی بیٹی ہے۔ بہت زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ سب سے عزت پاتی راج کرتی آئی ہے۔ یہاں وہ صرف چھوٹی بہو ہے۔ یہاں اسے ہر ایک کا ادب کرنا پڑتا ہے ہر ایک سے ڈرنا پڑتا ہے ہر ایک کا کہنا ماننا پڑتا ہے یہاں اس کی شخصیت دب کر رہ گئی ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں

(کچھ لمحے کے لئے حقہ گڑگڑاتے ہیں۔ پھر)

—— بیٹا بڑپن دراصل عمر کا نہیں ہوتا۔ بڑپن عقل کا ہوتا ہے۔ چھوٹی بہو عمر میں نہ سہی عقل میں یقیناً ہم سب سے بڑی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس کی عقل کا فائدہ اٹھائیں۔ میری خواہش ہے کہ اسے یہاں وہی ادب، وہی عزت ملے جو اسے اپنے گھر میں حاصل تھی۔ سب اس کا کہنا مانیں۔ اس سے صلاح لیں اور میں خوش ہوں گا۔ اگر اس کا

کام بھی تم لوگ آپس میں بانٹ لو اور اسے پڑھنے پڑھانے کا موقع دو۔ اسے محسوس نہ ہو کہ وہ کسی دوسرے گھر میں، دوسرے ماحول میں آگئی ہے۔

(پھر کچھ لمحہ حقّہ گڑگڑاتے ہیں۔ پھر)

—— بیٹا یہ کنبہ ایک مہان پیڑ ہے۔ ہم سب اُس کی ڈالیاں ہیں۔ ڈالیوں ہی سے پیڑ پیڑ ہے اور ڈالیاں چھوٹی ہوں چاہے بڑی، سب اُس کی چھایا کو بڑھاتی ہیں۔ مَیں نہیں چاہتا۔ کوئی ڈالی اس پیڑ سے ٹوٹ کر الگ ہو جائے۔ تم سب سمجھدار ہو۔ تم ہمیشہ میرا کہنا مانتے آئے ہو۔ بس یہی بات میں کہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ اگر میں نے سُن لیا —— کسی نے چھوٹی بہو کی بے عزتی کی ہے یا اس کا مذاق اُڑایا ہے یا اس کا وقت ضائع کیا ہے تو اس گھر سے میرا ناطہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائیگا ۔۔۔۔۔ اب تم سب جا سکتے ہو۔

(پھر حقّہ گڑگڑانے لگتے ہیں۔ سب دھیرے دھیرے جانے لگتے ہیں)

—— اندو بیٹیا اور منجھلی بہو تم ذرا بیٹھو۔

(دونوں کے علاوہ باقی سب چلے جاتے ہیں)

—— منجھلی بہو، تم اپنی ہنسی کو ان لوگوں تک ہی محدود رکھو بیٹیا، جو اسے برداشت کر سکتے ہیں، باہر کے لوگوں پر گھر میں بیٹھ کر ہنسا جا سکتا ہے۔ لیکن گھر کے لوگوں کو اس وقت تک ہنسی مذاق کا نشانہ بنانا ٹھیک نہیں، جب تک وُہ پورے طور پر گھر کا انگ نہ بن جائیں اور اندو بیٹیا تیری چھوٹی بھابی بڑی عقلمند اور سلیقے والی ہے تجھے اس کا مذاق اڑانے، اس سے لڑنے جھگڑنے کی بجائے اس کا ادب کرنا چاہئے، اس سے علم حاصل کرنا چاہیئے —— تم دونوں کو میں اس معاملے میں

خاص طور پر محتاط رہنے کی ہدایت کرتا ہوں

(پھر حقّہ گڑگڑانے لگتے ہیں۔ پھر)

—— اب تم جاؤ اور دیکھو پھر مجھے شکایت کا موقع نہ ملے (گلا بھر آتا ہے) میری یہی خواہش ہے کہ سب ڈالیاں ساتھ ساتھ بڑھیں، پھلیں پھولیں۔ زندگی کی ہوا کے لمس سے جھومیں اور سرسرائیں۔ درخت سے الگ ہونے والی ڈالی کا تصوّر ہی مجھے لرزا دیتا ہے۔

(پھر حقّہ گڑگڑانے لگتے ہیں)

اندو۔ ہمیں معاف کریں داداجی، ہماری طرف سے آپ کو شکایت کا موقعہ نہ ملیگا۔

(دونوں چلی جاتی ہیں۔ دادا کچھ لمحے حقّہ گڑگڑاتے ہیں۔ پھر باہر کھیلتے ہوئے بچوں کو آواز دیتے ہیں)

دادا۔ بھاشی، ملّو، جگدیش، آؤ آج تمہیں ایک کہانی سنائیں —— بڑ کے درخت اور اس کے بچوں کی .....

بھاشی (دروازے سے جھانک کر) ہم سُن چکے ہیں۔ ہم نہیں آتے، ہر بار وہی کہانی....

ملّو۔ چاند راجہ تارا راجہ کی سناؤ تو آئیں —— ہر بار وہی کہانی (نقل اتار کر) ایک تھا بڑ کا پیڑ.....

(ہنستے ہنستے پھر غائب ہو جاتے ہیں)

دادا۔ (ہنستے ہیں) یہی کہانی —— یہی کہانی تو کُنبے کو، سماج کو، قوم کو بناتی ہے یہی تو زندگی کو مضبوط، وسیع اور عظیم بناتی ہے۔

(حقّہ گڑگڑانے لگتے ہیں —— پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر۔

(وہی برآمدہ۔ دونوں تخت پوش ویسے ہی کھڑ کیوں کے نیچے رکھے ہوئے ہیں۔ دو چار پائیاں ویسے ہی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی ہیں۔ ہاں کرسی درمیان میں آگئی ہے ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ابھی چھوٹی بہو بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی ـــــ لیکن پردہ اُٹھنے پر وہ بے چینی کے ساتھ برآمدے میں گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ـــــ ایک ہاتھ میں کتاب ہے جس میں اس نے ابھی تک انگلی رکھی ہوئی ہے۔ گویا پڑھتے پڑھتے کوئی خیال آجانے سے اُٹھ کر گھومنے لگی ہو ـــــ)

چھوٹی بہو (اپنے آپ) میں کن لوگوں میں آگئی ہوں۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ میں کچھ بھی تو سمجھ نہیں سکی ـــــ آج کچھ ہیں کل کچھ ـــــ ان کا کچھ بھی تو پتہ نہیں چلتا

(پھر آہستہ آہستہ سوچتی ہوئی گھومتی ہے)

ـــــ (اپنے آپ) گرم ہوتے ہیں تو آگ بن جاتے ہیں اور نرم ہوتے ہیں تو موم سے بھی زیادہ کومل دکھائی دیتے ہیں۔ آج جس بات کو بُرا کہتے ہیں۔ کل اُسی کی تعریف کرتے ہیں ـــــ میں تو عاجز آگئی ہوں

(جا کر پھر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور کتاب کھول لیتی ہے۔ اندر گیلری سے اس کی ساس آتی ہے)

ساس۔ تم ٹھیک کہتی تھیں بیٹی۔ اس ردّی سامان سے بیٹھک بیٹھک نہیں رہی کسی کباڑی کا گودام لگتی تھی۔ خیال تھا کہ یہ سامان اتنی دیر سے اس کمرے میں پڑا ہے

اور کچھ ایسا بُرا بھی نہیں۔ آخر اس پر سب بیٹھتے آہی رہے ہیں، کہیں دادا جی غصے نہ ہوں۔ لیکن اچھا کیا تم نے جو وہ سب سامان اُٹھوا دیا ہے میں نے پریش سے کہہ دیا ہے ــــــ تم اُس کے ساتھ شہر جا کر اپنی پسند کے سامان کا آرڈر دے آؤ۔ یہ سب میں رجوا سے کہکر سریش کے کمرے میں پہنچوا دیتی ہوں ــــــ کئی بار وہ انہی کرسیوں کے لئے مجھ سے روٹھ چکا ہے۔

بیلا۔ آپ بیٹھئے ماں جی۔

ساس۔ بس تم بیٹھو۔ مَیں تو یونہی تمہیں ادھر بیٹھے دیکھ کر چلی آئی۔ اناج پڑا ہے اسے پھٹکنا ہے اور بیسیوں کام ہیں اور دن ڈھل رہا ہے۔ میرے دل میں خیال تھا کہ تم نے میری بات کا بُرا نہ مانا ہو۔ دراصل بیٹی رجوا میرے پاس آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ نوکرانی سمجھدار، معتبر اور فرمانبردار ہے۔ لیکن جو کام اُس نے کبھی کیا ہی نہ ہو۔ وہ اس سے کس طرح ہو سکتا ہے۔

بیلا (اٹھتی ہوئی) آپ بیٹھئے تو......

ساس (اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھاتے ہوئے) بیٹھو بیٹھو بیٹی، تکلیف نہ کرو۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہ ضائع کروں گی۔ مَیں تو تم سے صرف اس کی سفارش کرنے آئی تھی۔ پُرانی عورت ہے، جلدی ہی بات کا بُرا مان جاتی ہے۔ تم ایسے کرو کہ جونہی نیا فرنیچر آ جائے۔ اُسے ایک بار اپنے سامنے سب کچھ لگوا کر جھاڑنا، بہارنا سکھا دو۔ پھر وہ غلطی نہ کرے گی۔ نہ ہو کبھی مجھے بتا دینا ــــــ میں اسے سمجھا دوں گی۔

بیلا۔ نہیں نہیں آپ ......

ساس۔ تم پڑھی لکھی سمجھدار بیٹی، اس لیئے تم سے اتنا کہہ دیا ہے۔ یوں تم نہ چاہو تو کوئی دوسرا انتظام ہو جائے گا۔ تم اس بات کی بالکل فکر نہ کرنا۔

(چلنے کو ہوتی ہے)

بیلا۔ آپ بیٹھیئے تو سہی ......

ساس۔ نہیں نہیں تم اپنا پڑھو۔ میں بیکار تمہارا وقت ضائع کروں گی۔

(چلی جاتی ہے)

بیلا (کتاب بند کر کے لمبا سانس لیتے ہوئے جیسے اپنے آپ) ان لوگوں کی کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ماں جی ایک دم کیسے بدل گئیں۔ ابھی پرسوں مجھے اسی رجیا کیلئے ڈانٹ رہی تھیں۔ ان کا کچھ بھی تو پتہ نہیں چلتا

(پھر پڑھنے لگتی ہے ـــــ بڑی بہو اور منجھلی بھابی باہر کے دروازے سے داخل ہوتی ہے)

منجھلی بھابی۔ کہو بیٹی۔ اب رجیا کچھ کام سیکھ گئی ہے یا نہیں (فرا ہنستی ہے) بڑھیا ہے تو سیانی ......

بڑی بہو۔ آپ نے اندو سے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہمیں دراصل کام کی پرکھ نہیں مگر اب ....

بیلا۔ آیئے ادھر بیٹھیئے۔ چارپائی سرکا لیجیئے۔

منجھلی بھابی۔ (ویسے ہی کھڑے کھڑے) میں نے ایک تجربہ کار نوکرانی تلاش کرنے کے لیئے کہدیا ہے۔ جو نئے طرز کے بڑے گھروں میں کام کر چکی ہو۔ دراصل بہو، داداجی پرانے نوکروں کے حامی ہیں ـــــ دیانتدار ہوتے ہیں اور

قابلِ اعتبار ـــــ ہمارے ہاں نوکر پیڑھی در پیڑھی کام کرتے آ رہے ہیں۔ اس رجوا کی ساس بھی یہیں کام کرتی تھی۔ اب رجوا کی بہو بھی یہیں کام کرتی ہے......

بڑی بہو۔ میں کہتی ہوں بہن جی، آپ رجوا کی بہو ہی کو کیوں نہ اپنے پاس رکھ لیں۔ .... اس کی عمر بھی کم ہے اور کام بھی وہ جلدی سیکھ جائے گی

بیلا (بیدلی سے) نہیں نندے نوکر کی ضرورت نہیں۔ رجوا کام سیکھ جائیگی (قدرے چڑکر) پر آپ کھڑی کیوں ہیں۔

منجھلی بھابی۔ ہم تمہارا حرج نہ کریں گے......

بیلا (اور بھی چڑکر) میرا کچھ حرج نہیں ہوتا۔

بڑی بہو۔ ہم آپ سے چھوٹی ہیں عقل میں بھی اور درجے میں بھی.....

بیلا۔ (اٹھ کر روکھی آواز میں) آپ مجھے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتی ہیں..... آپ میرے ساتھ کیوں اجنبیوں کا سا سلوک کرتی ہیں..... آپ ابھی تک کھڑی کیوں ہیں"

(اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

بڑی بہو۔ بیٹھئے بیٹھئے۔ منجھلی بھابی آپ بھی بیٹھئے......

بیلا۔ میں چلتی ہوں۔

(آنکھوں پر رومال رکھے جلدی جلدی چلی جاتی ہے)

منجھلی بھابی (جیسے اپنے آپ) اجنبیوں کا سا...

(باہر سے منجھلی بہو کے قہقہے کی آواز آتی ہے۔ دوسرے لمحے وہ اندو اور پارو کے کندھے پر جھولتی ہوئی باہر کے دروازے سے آتی ہے)

اندو۔ سچ......

منجھلی بہو (ہنسی روک کر) اور کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ میں نے اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھا (ہنستی ہے) ملادی نے ساری کی ساری چھت پھاوڑے سے کھود ڈالی اور بنسی لال مہاشے منہ دیکھتے رہ گئے۔

(سب قہقہہ مار کر ہنس پڑتی ہیں)

بڑی بہو۔ جھنی مجھے بھی بتانا ـــــ کیا کیا ملادی نے ـــــ سچ ـــــ

[منجھلی بہو چارپائی بچھا کر اس پر دھنس جاتی ہے۔ اس کے ایک طرف اندو اور دوسری طرف پارو بیٹھ جاتی ہیں منجھلی بھابی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور بڑی بہو کھڑی رہتی ہے]

منجھلی بھابی (کرسی کو ذرا کھسکا کر نزدیک ہوتے ہوئے) بنسی لال کے سامنے اکھاڑ کر پھینک دی۔

منجھلی بہو۔ میں کہتی ہوں۔ منہ دیکھتے رہ گئے بنسی لال مہاشے۔ تکتے گئے مڑ مڑ....

(سب قہقہہ لگاتی ہیں)

بڑی بہو۔ ارے کونسی چھت کھود ڈالی۔ یہ تو بتاؤ......

منجھلی بہو۔ رسوئی کی، اور کونسی۔ ابھی دو گھنٹے ہوئے کہ راج مزدور چھت ڈال کر گئے تھے اور بنسی لال مزدوروں وغیرہ سے نبٹ کر ابھی دوکان کو گیا تھا کہ آ گئی ادھر سے ملادی مار و مار کرتی۔ جانے کس نے اسے جا کر بتایا کہ تمہارے دیور نے اپنی رسوئی پر چھت ڈال لی ہے لے کے پھاوڑا بس، ساری کی ساری چھت اُس نے کھود ڈالی۔ بنسی لال جب پہنچے۔ جب آخری کڑی بھی اکھڑ چکی تھی۔ تب کیا کرتے۔ بس تکتے گئے مڑ مڑ.....

(منجھلی بھابی کو چھوڑ کر سب ہنستی ہیں)

منجھلی بھابی۔ لیکن بنسی لال کا لڑکا.....

منجھلی بہو۔ گلی کے سرے پر کھڑا خم ٹھونک رہا ہے۔

اندو۔ خم ٹھونک رہا ہے۔

منجھلی بہو (قہقہہ لگاتی ہے) سچ خم ٹھونک رہا ہے اور ہوا ہی میں للکار رہا ہے کہ میں ڈیوڑھی کی چھت کھود ڈالوں گا۔ میں مکان کو کھنڈر بنا دوں گا۔ میں یہ کر دوں گا۔ میں وہ کر دوں گا اور ادھر ملا دی کمر کسے کھڑی ہے کہ آئے جو مائی کا لال ہے۔ رکھے قدم گھر کے اندر.....

(سب ہنستی ہیں)

اندو (سرگوشی کے انداز میں) ش ۔ ش... چھوٹی بھابی آ رہی ہیں۔

[ہنسی ایک دم بند ہو جاتی ہے۔ سب خاموش ہو جاتی ہیں۔ بیلا ایک ہاتھ میں بند کتاب تھامے آہستہ آہستہ داخل ہوتی ہیں]

بیلا۔ کیوں جی جی۔ آپ چپ کیوں ہو گئیں (ذرا ہنس کر) کس بات پر یہ قہقہے لگائے جا رہے ہیں۔

منجھلی بھابی (کرسی سے اٹھ کر) یونہی ہنس رہی تھیں۔ آؤ ادھر کرسی پر بیٹھو۔

بیلا۔ نہیں نہیں آپ بیٹھیے۔ میں ادھر تخت پوش پر بیٹھ جاتی ہوں۔

منجھلی بہو (جلدی سے اٹھ کر) آئیے آئیے آپ ادھر بیٹھیے۔

اندو اور پارو۔ (دونوں چارپائی سے اٹھ جاتی ہیں) آئیے آئیے آپ ادھر بیٹھیے....

[پھر خاموشی چھا جاتی ہے جس میں ایک طرح کی گھٹن ہے۔ بیلا باہر کی طرف

کو چل پڑتی ہے]

اندو۔ بیٹھئے بھابی جی ..... آپ چلی کیوں۔

بیلا۔ (مڑ کر تھکی بھاری بھاری آواز میں) میں تو ادھر ہی جا رہی تھی۔ یونہی جاتے جاتے کھڑی ہو گئی۔ میں آپ کی ہنسی میں مخل نہیں ہونا چاہتی (مغموم سی ہنسی کے ساتھ) آپ ہنسئے، قہقہے لگائیے۔

(چپ چاپ پچھلے دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

منجھلی بہو۔ میں کہتی تھی نہ کہ اس طرف نہ آؤ۔ میری کمبخت عادت ہوتی ہنسنے کی

اندو۔ اب ایک یہی جگہ تھی بیٹھنے کی۔

منجھلی بہو۔ لیکن ہم ہنستی ہیں تو ہنستی ہیں دل سے، اور چھوٹی بہو کے مطالعہ میں خلل پڑتا ہے۔ میں کہتی ہوں ——— دادا جی کو اگر معلوم ہو گیا کہ ہمارے یہاں بیٹھنے اور ہنسنے سے چھوٹی بہو کے پڑھنے میں خلل آتا ہے تو ....

اندو۔ لیکن یہی ایک جگہ تھی پروے والی ....

منجھلی بہو۔ تم بھول گئیں ہمیں ہی تو دادا جی نے خاص طور پر خبردار کیا تھا (پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی ہے) میں کہتی ہوں چلو میرے کمرے میں .....

اندو۔ مجھے تو دادا جی کے کپڑے دھونے ہیں۔ میں چلی۔

(جلدی جلدی باہر کی طرف چلی جاتی ہے)

منجھلی بھابی۔ ٹھیک ہے تم لوگ اب یہاں اتنا نہ بیٹھا کرو (بڑی بہو سے) ہم تو بہو گودام میں جا رہی تھیں۔ چلو گیہوں چھٹوا لیں۔ چھوٹی بہن تو کب کی گئی ہوئی ہے پھر تو ڈھل جائیگا دن اور مہریاں چلی جائیں گی۔

بڑی بہو۔ میں تو پھنس گئی منجھلی کی باتوں میں . . . چلو . . . چلو۔
(دونوں چلی جاتی ہیں)

منجھلی بہو۔ میں کہتی ہوں پارو چلو میرے کمرے میں۔ وہاں چل کے بیٹھیں۔
پارو۔ مجھے تو جانا ہے بھابی، للّا آگیا ہوگا۔ نہ ملی تو چیخے گا۔
(چلی جاتی ہے۔ منجھلی بہو اکیلی رہ جاتی ہے)

منجھلی بہو (اپنے آپ سے) یہ چھوٹی بہو تو عقاب سی آکر سب کو ڈرا گئی
[ذرا ہنستی ہے۔ باہر سے بڑی بھابی آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے بھاگ کر اس کے پاس جاتی ہے]

—— بڑی بھابی سُنی تم نے ملاوی کی بات۔ کھو ڈالی اُس نے ساری کی ساری چھت۔

(قہقہہ لگاتی ہے)

بڑی بھابی۔ ملاوی نے۔ چھت کھو ڈالی . . . . .

منجھلی بہو (اسے اپنے ساتھ لیکر اپنے کمرے کی طرف جاتی ہوئی) ہاں ہاں۔ ابھی راج مزدور چھت بنا کر گئے تھے کہ آگئی ملاوی مارو مار کرتی

بڑی بھابی۔ لیکن . . . . .

منجھلی بہو۔ چلو میرے ساتھ میرے کمرے میں۔ وہاں چل کر سب بتاتی ہوں۔ یہاں تو چھوٹی بہو کی پڑھائی میں خلل پڑتا ہے۔

(اسے ساتھ لے کر اپنے کمرے کی طرف جاتی ہے۔ باہر سے پرشا اور بیلا داخل ہوتے ہیں)

بیلا (رُوکھی آواز میں) آپ مجھے میرے میکے بھیج دیجئے۔ میں ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے میں اجنبیوں میں آ گئی ہوں۔ کوئی مجھے نہیں سمجھتا۔ کسی کو میں نہیں سمجھتی۔

پریش۔ آخر بات کیا ہے۔ کچھ کہو بھی۔

بیلا۔ میں جاتی ہوں تو سب کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بڑی بھابی، منجھلی بھابی اور ماں جی تک ——— میرے سامنے کوئی ہنستا نہیں۔ مجھ سے کوئی زیادہ دیر بات کرنا نہیں چاہتا ——— سب مجھ سے ایسے خوف کھاتے ہیں جیسے مرغی کے بچے شکرے سے۔ ابھی ابھی سب ہنس رہی تھیں۔ قہقہے پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ میں آئی تو سب ایسے سُن رہ گئیں جیسے بھرے ہوئے مجمع میں کسی نے سیٹی بجا دی ہو۔

پریش۔ پر اس میں .....

بیلا۔ اور کوئی مجھے کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا۔ میں ذرا سا کام کرنے لگوں تو سب بھاگے آتے ہیں۔ سب میرا اس طرح ادب کرتے ہیں۔ گویا میں ہی اس گھر میں سب سے بڑی ہوں۔

پریش۔ میں نہیں سمجھتا تم کیا چاہتی ہو۔ تمہیں شکایت تھی ——— کوئی تمہارا ادب نہیں کرتا۔ اب سب تمہاری عزت کرتے ہیں ——— تمہیں شکایت تھی۔ تمہیں سب سے دبنا پڑتا ہے۔ اب سب تم سے دبتے ہیں ——— تمہیں شکایت تھی۔ تم سب کا کام کرتی ہو۔ اب سب تمہارا کام کرتے ہیں ——— ادب، عزت، آرام ——— نہ جانے تم اور کیا چاہتی ہو

(تیزی سے سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے)

بیلا (نڈھال ہو کر کرسی میں دھنس جاتی ہے) نہ جانے میں کیا چاہتی ہوں (سسکنے لگتی ہے) نہ جانے میں کیا چاہتی ہوں۔ لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ میں یہ ادب، عزت آرام نہیں چاہتی۔

(چہرہ بازوؤں میں چھپا کر سسکتی ہے۔ اندو ہاتھ میں کچھ میلے کپڑے لئے ہوتے باہر کے دروازے سے داخل ہوتی ہے)

اندو۔ بھابی جی!

بیلا (اسی طرح چپ بیٹھی رہتی ہے)

اندو (بیلا کے کندھے کو ہلا کر) بھابی جی.... بھابی جی....

(بیلا منہ اوپر اٹھاتی ہے)

اندو۔ ہیں بھابی جی آپ تو رو رہی ہیں۔

بیلا (آنکھیں پونچھ کر) نہیں میں رو نہیں رہی —— پر اندو پرماتما کیلئے مجھے "جی، جی" کر کے نہ بلایا کرو۔

اندو۔ تو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ مجھ سے بڑی ہیں اور پھر آپ مجھ سے کہیں زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔ عمر اور عقل میں بھی آپ مجھ سے......

بیلا۔ پہلے تو تو مجھے یوں "جی، جی" کر کے نہ بلایا کرتی تھی۔

اندو۔ میں تو مورکھ ٹھہری بھابی جی، دادا جی نے کہا تھا....

بیلا (اچانک چونک کر) دادا جی نے کیا کہا تھا؟

اندو۔ انہوں نے سب کو سمجھایا کہ گھر میں سب کو آپ کی عزت کرنی چاہئے، آپ عقل میں ہم سب سے بڑی ہیں۔

بیلا۔ لیکن اُنہوں نے یہ سب کو کیوں کہا۔ میں نے تو کبھی اُن سے اس بات کی شکایت نہیں کی۔

اندو۔ شاید چھوٹے بھیّا نے اُن سے یہ کہا تھا کہ آپ کا جی یہاں نہیں لگتا اور آپ باغ والے.....

بیلا۔ اوہ! ——

اندو۔ اور دادا جی اور سب کچھ سہہ سکتے ہیں کسی کا الگ ہونا برداشت نہیں کر سکتے وُہ کہا کرتے ہیں —— "ہم سب ایک مہان پیڑ کی ڈالیاں ہیں اور اس سے پہلے کہ کوئی ڈالی ٹوٹ کر الگ ہو میں سنسار سے ناطہ توڑ لینا چاہتا ہوں۔" اور اُنہوں نے ہم سب کو سمجھایا کہ ہم سب آپ کا کام کریں اور آپکو پڑھنے پڑھانے کا موقع دیں۔

بیلا۔ لیکن میں تو اب نہیں چاہتی اور میں تو تم سب کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتی ہوں۔

اندو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھابی جی.....

بیلا (لمبا سانس بھرتی ہے) آپ لوگوں نے مجھے کتنا غلط سمجھا اور میں نے آپ لوگوں کو.....

اندو۔ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ لائیے کپڑے لائیے۔ میں دادا جی کے کپڑے دھونے جا رہی ہوں۔ ساتھ ہی آپ کے بھی پھٹک لاؤں۔

بیلا (چُپ سوچتی ہے)

اندو۔ بھابی جی.....

بیلا (گویا اُس نے من میں کسی بات کا فیصلہ کر لیا ہو) اندو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤ نگی میں بھی تمہارے ساتھ کپڑے دھوؤں گی۔

اندو۔ دادا جی غصّے نہ ہوں گے.....

بیلا۔ میں دادا جی سے کہہ دوں گی (گلے کے انداز میں) تم لوگوں نے مجھے اچھوت بنا دیا ہے۔

اندو۔ بھابی جی . . . .

بیلا۔ مجھے صرف بھابی کہا کر میری پیاری اندو۔ دیکھ میں تجھ سے اپنی پچھلی باتوں کیلئے معافی مانگتی ہوں۔

اندو (پیار سے بھرے ہوتے گلے کیساتھ) بھابی . . . .

بیلا۔ چل چل کپڑے دھو ئیں۔ دھوپ تو نکلی جا رہی ہے

اندو۔ لیکن کپڑے . . . .

بیلا۔ میرے کپڑے آج رجوا نے دھو دیئے تھے۔ شلوار قمیص ہی تو تھی۔ چل میں تیرے ساتھ مدد کراؤں گی۔

[دونوں چلی جاتی ہیں۔ کچھ لمحوں کے بعد برآمدے میں کپڑے دھونے کی آواز آنے لگتی ہے۔ دادا گیلری کی طرف سے حقہ گڑگڑاتے کڑکڑاتے داخل ہوتے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں گڑگڑی ہے اور دوسرے ہاتھ میں ملّو کی انگلی ہے]

دادا۔ ہاں بیٹا تجھے میلے میں لے چلیں گے جو تو کہے گا وہی کھلونا لے دیں گے۔

ملّو۔ میں تو اُڑن کھٹولا لوں گا۔

(اچانک باہر کے دروازے کے پاس جا کر دادا ٹھٹک جاتے ہیں)

دادا (حیرت سے) ہیں چھوٹی بہو . . . . .

اندو۔ (باہر سے) میں نے تو بہتیرا کہا۔ پر بھابی مانی نہیں۔

دادا۔ چھوٹی بہو۔ ادھر آ بیٹی۔

(شرمائی ہوئی بیلا دروازے کے پاس آ کھڑی ہوتی ہے)

——بیٹی کپڑے دھونا تمہارا کام نہیں۔ اتنا پڑھ لکھ کر......

اندو (جو اپنی بھابی کے ساتھ ہی آ کھڑی ہوئی ہے) میں نے تو بہتیرا کہا۔ پر بھابی مانی نہیں....

دادا (جنہیں اندو کے لہجے کی بے ادبی اچھی نہیں لگی) اندو تجھے اتنی بار کہا ہے کہ ادب سے....

بیلا (جذبات کے سبب رندھے ہوئے گلے سے) دادا جی آپ پیڑ سے کسی ڈالی کا ٹوٹ کر الگ ہونا پسند نہیں کرتے۔ لیکن کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ پیڑ سے لگی لگی وہ ڈالی سوکھ کر مرجھا جائے.....

(سسک اٹھتی ہے حقے کی گڑگڑاہٹ ایک دم بند ہو جاتی ہے)

(پردہ ایک دم گرتا ہے)

کتبہ:۔ اقبال عباسی لاہور